قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۸۷ شمارہ: ۱
محرم الحرام: ۱۴۴۵ھ - اگست: ۲۰۲۳ء
قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۶۵۰ روپے

مُدیر/ مُدیر مسئول
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر
مولانا سید احمد یوسف بنوری

مُدیر مُعاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465
فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر
عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: 92-21-34919531 +
Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

آسمانی کتب اور مقدسات کا احترام!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات و مضامین

مکاتیب حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاںؒ بنام حضرت بنوریؒ	۶	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
شامتِ اعمال!	۱۰	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ
اسلامی اذکار اور دعائیں!... احکام وفضائل	۱۹	حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتیؒ
مجاہدہ ... تزکیۂ نفس کا ذریعہ	۳۰	مولانا محمد راشد شفیع
خواتین کا رجال سازی میں کردار!	۳۲	مولانا عصمت اللہ نظامانی
نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی... موجودہ مسائل کا حقیقی حل	۳۷	مولانا سفیان علی فاروقی
عصرِ حاضر میں قرآن کریم سے بے توجہی	۳۹	مولوی محمد طیب حنیف
علمائے کرام اور سائنسدانوں کی ذمہ داریاں... کام کا دائرہ کار	۴۴	جناب ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قانونی تنظیم!	۵۳	ڈاکٹر ساجد خاکوانی

دار الافتاء

حج کی خوشی میں دعوت کرنا اور پھولوں کا ہار پہنانا	۵۹	ادارہ

نقد و نظر

امام اعظم ابوحنیفہؒ، شہیدِ اہلِ بیتؓ ... مسنون استخارہ		
فتنۂ انکارِ حدیث ... الشہاب الثاقب	۶۱	ادارہ

آسمانی کتب اور مقدسات کا احترام!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

جس طرح سانپ اور بچھو کی سرشت اور فطرت میں انسان کو ڈسنا اور ڈنگ مارنا شامل ہے، خواہ ان کے ساتھ کتنا بھی ہمدردی اور اچھا سلوک کرلیا جائے، مگر یہ اپنی عادت سے باز نہیں آتے، اسی طرح دینِ اسلام کے دشمنوں کی جبلّت میں اسلام، پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو اذیت دینا اور تکلیف پہنچانا شامل ہے، اور ان کے ساتھ خواہ جس قدر بھی رواداری کا مظاہرہ کرلیا جائے، یہ اپنے خبثِ باطن کے اظہار سے کبھی باز نہیں آتے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’إِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّإِثْمًا مُّبِيْنًا۔‘‘

(الاحزاب:۵۷،۵۸)

ترجمہ: ’’جو لوگ ستاتے ہیں اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اُن کو پھٹکارا اللہ نے دنیا میں اور آخرت میں، اور تیار رکھا ہے اُن کے واسطے ذلت کا عذاب، اور جو لوگ تہمت لگاتے ہیں مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بدون گناہ کیے تو اُٹھایا انہوں نے بوجھ جھوٹ کا اور صریح گناہ کا۔‘‘

(ترجمہ از حضرت شیخ الہندؒ)

چنانچہ آئے روز کبھی آنحضرت ﷺ کی شانِ اقدس میں گستاخی اور کبھی قرآن کریم کی توہین وتنقیص کے واقعات کا مغرب میں پیش آنا معمول بن چکا ہے، ہر چھ ماہ یا سال بعد کسی نہ کسی ایسے گھناؤنے فعل کا ارتکاب کردیا جاتا ہے جو اربوں مسلمانوں کے دلوں کو چھلنی کردیتا ہے۔ آئے دن اشتعال انگیز بیانات، دھمکیاں اور تشدد مغربی اقوام کا معمول بن چکا ہے۔

سالِ رواں کے آغاز میں بھی سوئیڈن و ہالینڈ میں توہینِ قرآن کے واقعات پیش آئے تھے، اور اب ۲۹/جون ۲۰۲۳ء کو جب پاکستان سمیت دنیا کے مختلف ممالک میں عیدالاضحیٰ منائی جارہی تھی تو سوئیڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہومز کی مرکزی مسجد کے باہر، مسلمانوں کے اجتماع کے سامنے، ریاستی پولیس کی حفاظت میں، باقاعدہ عدالتی اجازت نامہ کے تحت قرآن کریم کو جلاکر انہوں نے اسلام دشمنی کے تسلسل کو ٹوٹنے نہ دیا اور ثابت کردیا کہ یہ وہ سانپ اور بچھو ہیں جو ڈسنے اور ڈنک مارنے سے کبھی باز نہیں آسکتے۔

خبروں میں بتایا گیا ہے کہ یہ شخص عراق کا شہری اور ملحد ذہنیت کا حامل ہے اور اس نے سوئیڈن جاکر وہاں کی عدالت سے اس عملِ بد کی اجازت کے لیے رجوع کر رکھا تھا، عدالت کے استفسار پر سوئیڈن پولیس نے بدنیتی سے کام لیتے ہوئے رپورٹ جمع کرائی کہ ایسے واقعے پر کوئی ردِعمل نہیں آئے گا، جو ظاہر ہے کہ سراسر خلافِ حقیقت تھی، کیونکہ توہینِ قرآن کے اس واقعے کے بعد سوئیڈن سمیت پوری دنیا کے مسلمان سراپا احتجاج بن گئے، اسلامی ممالک کی عالمی تنظیم او آئی سی نے ہنگامی اجلاس طلب کرکے اس سانحے کے خلاف سخت ترین کارروائی کا مطالبہ کیا۔ عراق، کویت، عرب امارات اور مراکش نے سوئیڈن کے سفیروں کو طلب کرکے شدید احتجاج ریکارڈ کرایا، ترکیہ، لبنان، اردن، فلسطین، سعودی عرب اور پاکستان نے سوئیڈن سے مجرم کو سزا دینے کا مطالبہ کیا۔

پاکستان کے وزیراعظم جناب میاں محمد شہباز شریف نے اقوامِ متحدہ سے اس دل سوز سانحے پر اجلاس بلانے کا مطالبہ کیا، اور ۷/جولائی بروز جمعہ ملک بھر میں سرکاری سطح پر یومِ تقدیسِ قرآن منانے کا اعلان کیا، جب کہ حکومتی اتحاد پی ڈی ایم کے سربراہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کی اپیل پر جمعیت علمائے اسلام سمیت تمام دینی وسیاسی جماعتوں نے جمعہ کے روز احتجاجی ریلیاں نکالیں، مساجد میں احتجاجی قراردادیں منظور کی گئیں، اور مدارس میں قرآن کریم کی تلاوت کی گئی۔

عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے تحت ملک کے تمام بڑے شہروں میں احتجاج کیا گیا، اور کراچی

پریس کلب کے سامنے ایک احتجاج ریکارڈ کرایا گیا جس میں دوسرے علماء کے ساتھ ساتھ راقم الحروف نے بھی بیان کیا، جس میں بڑی تعداد میں عوام الناس نے شرکت کی۔ تاجر برادری، وکلاء برادری نے بھی احتجاجی ریلیاں نکالیں، بار کونسلوں میں مذمتی قراردادیں منظور کی گئیں، اور عدالتی کارروائی کا بائیکاٹ کیا گیا۔ یوں قرآن دشمن طبقے کو پوری امتِ مسلمہ نے متفقہ ردِعمل سے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔

چنانچہ سوئیڈن حکومت جس نے پہلے تو یہ بیان جاری کیا تھا کہ ہمارا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ یہ سب سوئیڈن ہی کی عدالت کی اجازت سے ہوا تھا، اب وہ یہ اعلان کررہی ہے کہ توہینِ قرآن کے مجرم کو سزا دی جائے گی اور آئندہ اس قسم کے واقعات کو روکنے کے لیے قانون سازی ہوگی۔ یقیناً یہ اہلِ اسلام کی بڑی کامیابی ہے، جو اتحاد و اتفاق کا ثمرہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں پر کچھ اہم ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں:

①-قرآن کریم کی تلاوت کا معمول شب و روز حرزِ جاں بنائیں اور کبھی اس میں ناغہ نہ ہونے دیں۔

②-قرآن کریم کا ترجمہ وتفسیر علمائے کرام سے سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوں، اور دنیا میں جہاں جائیں، جس شعبے میں کام کریں، تو اپنے کردار سے قرآن کریم کا پیغام عام کریں۔

③-خصوصاً غیر مسلم ممالک میں مقیم مسلمان، جن پر ہر وقت غیر مسلموں کی نظر رہتی ہے اور بعض اعمال میں مسلمانوں کو کمزور اور کوتاہ دیکھ کر اُن کی یہ رائے قائم ہوجاتی ہے کہ یہ بھی ہمارے ہی جیسے ہیں، انہیں چاہیے کہ اپنے مضبوط ایمانی اور اسلامی کردار اور عملی زندگی سے دینِ اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ ادا کریں اور کبھی اس میں کوتاہی نہ ہونے دیں۔

④-اقوامِ متحدہ کے پلیٹ فارم سے آسمانی الہامی کتب اور انبیائے کرام علیہم السلام کی توہین و تنقیص کے سدِباب کے لیے بین الاقوامی معاہدہ و قانون سازی کی جائے اور کسی بھی مذہب کے مقدسات کی توہین کے مرتکب کو بلاامتیاز سزا دی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں قرآن کریم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے، اس کی دعوت کو دنیا بھر میں عام کرنے، اور اس کی حفاظت کے لیے عملی کردار ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علیٰ آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیب حضرت مولانا محمد بن موسیٰ میاں رحمۃ اللہ علیہ [1]

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳/ذوالحجہ سنہ ۱۳۶۳ھ - ۲۰/نومبر ۱۹۴۴ء

محبِ مخلص مولانا سید محمد یوسف صاحب دامت برکاتکم، سملک

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عرصہ سے گرامی نامہ نہیں ملا، اُمید (ہے) کہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ الحمدللہ یہاں امن وعافیت ہے۔ ۲۷/اکتوبر کو آپ کے نام چار پاؤنڈ کا منی آرڈر کیا ہے، ان شاء اللہ مل گیا ہوگا۔ یہ رقم آپ کے مصارفِ ذاتیہ کے لیے ہدیہ ہے، وصول وقبول فرما کر رسیدِ وصول یابی تحریر فرمائیے گا، ولکم الفضل والمنة!

مخدوم حاجی چچا صاحب مدظلہ [2] کے نوازش نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ کسی وجہ سے آپ کے

---

(۱) مولانا محمد بن موسیٰ میاں رحمہ اللہ، دار العلوم دیوبند کے فاضل اور علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے خاص معاون اور مجلسِ علمی (ڈابھیل وکراچی) آپ ہی کا قائم کردہ ادارہ ہے، جس سے علامہ کشمیریؒ و دیگر اکابر کی گراں قدر کتابیں شائع ہوئیں۔ والد ماجد حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ سے محبت ومودت کا گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ۲۱/ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۶/اپریل ۱۹۶۳ء کو جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں وفات پائی۔ (ملاحظہ فرمائیے: تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، از مفتی عبد القیوم راجکوٹی، ص:۱۸۱و۱۸۲، ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

(۲) مولانا محمد بن موسیٰ میاںؒ کے چچا حاجی ابراہیم میاں رحمہ اللہ مراد ہیں۔ موصوفؒ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے ابتدائی دور میں خزانچی اور بعد میں کچھ عرصہ مہتمم بھی رہے۔ ۲۹ذوالحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق ۴/فروری ۱۹۷۳ء کی شب میں وفات پائی۔ (ملاحظہ فرمائیے: تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، از مفتی عبد القیوم راجکوٹی، ص:۲۱۶)

موجودہ مشغلہ سے خاطر برداشتہ ہیں، افسوس ہوا۔ میں دعا گو ہوں کہ آپ کی خاطر جمعی ہوجائے، اور آپ اپنے کاموں کو اطمینان سے پورا کرسکیں، اللّٰھم استجب دعوتي۔

فرزند[1] کی ولادت کی اطلاع مولانا محمد نانا صاحب کے خط سے ہوئی، اللہ نیک نصیب کرے اور والدین کے لیے قرۃ العین ہو۔ نام کیا رکھا ہے؟ تحریر فرمائیے گا۔

فی الحال مجلس (مجلسِ علمی، ڈابھیل) میں کیا کام ہو رہا ہے؟ اور کن کاموں کی تکمیل کی ضرورت ہے؟ اپنے خیالات اور مشورہ لکھیے گا، اور گاہے گاہے اپنی اور بچوں کی خیریت کا خط اور اپنے علمی مشاغل کے حالات لکھا کیجیے گا، انتظار اور شوق ہے۔

مولانا احمد بزرگ صاحب[2]، حاجی ابراہیم چچا صاحب، مولانا احمد رضا صاحب[3]، مولوی نورالدین، مولوی حبیب اللہ صاحبان کو سلام، بچوں کو پیار و دعاء۔

چند جانماز قالین کی ضرورت ہے، فی الحال پشاور میں دست یاب ہیں یا نہیں؟ ملتے ہوں تو چند چار پانچ منگوا بھیجیے گا، حاجی چچا قیمت ادا فرمادیں گے۔

والد صاحب مدظلہ (مولانا محمد زکریا بنوری رحمہ اللہ) کو خط لکھیں تو میرا سلام لکھیے گا۔

والسلام

احقر محمد بن موسیٰ عفا اللہ عنہما

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم ومحترم جناب مولانا سید محمد یوسف صاحب دامت فیوضکم السامیة! (مجلسِ علمی، سملک)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

---

(۱) والد ماجد حضرت بنوری رحمہ اللہ کے پہلے صاحب زادے محمد الیاس مراد ہیں، جو کم عمری میں ہی وفات پاگئے تھے۔

(۲) مولانا احمد بزرگ رحمہ اللہ، دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے مہتمم رہے۔ آپ کی دعوت پر ہی علامہ کشمیریؒ اور ان کے رفقاء، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل تشریف لائے۔ ولادت غالباً ۱۲۹۸ھ میں ہوئی اور ۱۳۷۱ھ میں وفات پائی، سملک کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ (ملاحظہ فرمائیے: تاریخ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل، از مفتی عبدالقیوم راجکوٹی، ص: ۳۱۵ تا ۳۲۱)

(۳) مولانا سید احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، علامہ کشمیری رحمہ اللہ کے خاص شاگرد اور داماد تھے۔ مجلسِ علمی میں والد ماجد حضرت بنوری رحمہ اللہ کے رفیقِ کار رہے، مصر وغیرہ کے سفر میں بھی رفاقت رہی۔ حضرت کشمیری رحمہ اللہ کے افادات پر مشتمل کتاب انوار الباری شرح صحیح البخاری موصوف نے ترتیب دی ہے۔ ۱۴۱۸ھ میں وفات پائی۔

آپ کا گرامی نامہ اور کارڈ دونوں ملے تھے، اور حسبِ ارشاد اجمالی جواب تار سے دے دیا تھا۔ مجلسِ علمی کو منتقل کرنے کے لیے پہلے سے بھی خیال تھا، اور اب بھی ارادہ ہے، لیکن شاید اس میں کچھ تاخیر ہو۔ اللہ جلّ ذکرُہ کو منظور ہو تو کیا عجب ہے کہ نہ صرف مجلس، بلکہ ایک ایسا مرکز نصیب ہو کہ جہاں اعلیٰ تعلیم و تربیت، تصنیف و تالیف، تبلیغ و خالص اسلامی زندگی، بود و باش کی فراغت سب یکجا مل جائیں، اللہ جلّ شانُہٗ جلد مقدر فرما دے۔

یہ کہ آپ صرف تنخواہ کی کمی بیشی کی وجہ سے علیحدہ ہو رہے ہیں، اس کو میرا دل باور نہیں کرتا۔ آپ یا مجلس ایک دوسرے کے لیے گراں بار ہے، اس خیال کو دل سے نکال دیجیے، ہمارے آپ کے تعلقات اور خلوص میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ صرف افسوس اور قلق اس بات کا ہے کہ آپ کی سب سے بہتر افادی خدمت درسِ حدیث فی الحال منقطع ہے، اس کا بہت زیادہ صدمہ اور پریشانی ہے، اسی وجہ سے عارضی رخصت پر بھی آمادہ ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کوئی بہتری پیدا فرما دے، آمین!

آپ نے پوری وضاحت اور صاف دلی سے بات لکھ دی، یہ اچھا کیا۔ مجھے تو آپ کے صاف لہجہ سے بہت فائدہ بھی ہو جاتا ہے، اور زعم کو درست بھی کر لیتا ہوں، اور بہر حال آپ کے نوازش ناموں کے بہت سے حصے مفید مشوروں پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لیے ان سب کا شکریہ عرض ہے۔ آپ ہمیشہ خطوط و دعاؤں سے یاد فرماتے رہیں۔

والد صاحب مدظلہ کو میرا سلام لکھیں، بچوں کو پیار و دعاء۔

والسلام

احقر محمد بن موسیٰ میاں عفا اللہ عنہما

۲۲ / ربیع الاول سنہ ۱۳۶۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الأحد، ۱۶ / جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۶۷ھ

محترم و مکرم جناب مولانا سید محمد یوسف صاحب زیدت مکارمکم! سملک

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

کل ایک عریضہ حاجی ابراہیم میاں چچا صاحب کے ہاتھ بھیج چکا ہوں، جو مل گیا ہوگا۔ یہاں محمد

ظفر احمد انصاری صاحب تشریف لائے تھے، مولانا شبیر احمد صاحب (عثمانی) کے مشورہ سے وہ یہاں ایک اجتماع کرنا چاہتے ہیں، جس میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (حیدر آبادی)، مولانا سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع صاحب وغیرہ حضرات بلائے جا رہے ہیں، یہ لوگ یہاں چند ماہ قیام فرما کر اسلامی نظامِ حکومت کا خاکہ تیار فرمائیں گے، ان کے لیے مراجعت کے لیے کتابوں کی ضرورت ہوگی۔

ظفر صاحب کی یہ خواہش ہے کہ مجلس کی کتابوں میں سے جن کتابوں میں اس کا مادہ ہو، وہ کتابیں یہاں آجائیں تو کام میں سہولت ہوگی۔ آپ انتخاب فرما کر ایسی کتابوں کو ایک صندوق میں بند کر کے کسی معتمد آنے والے کے ہمراہ بھیج دیں۔ عنقریب یوسف سلیمان بہرہ، آسنہ سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ آنے والے ہیں، ان کو یہ بکس دے دیا جائے تو وہ بخوشی ساتھ لائیں گے، میں نے انہیں کہہ دیا ہے۔ سورت سے جناب حاجی محمد صدیق واگہ بکری والے بھی شاید آ رہے ہیں، ان کے ہمراہ اور جو کوئی اور پہلا آدمی آ رہا ہو، ہر ایک کے ساتھ رفتہ رفتہ کتب خانہ وذخیرہ آتا رہے تو اچھا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ دو ثلث ذخیرہ اور پورا کتب خانہ یہاں جلد آجائے، جو ہانسبرگ سے بھی اس کا تقاضا ہے۔

واپسی ڈاک یہ تحریر فرمائیں کہ بخاری وترمذی کہاں تک ہوگئی؟ اور رفتار کیا ہے؟ مسجدِ سملک میں گاہ بگاہ طلبہ آجاتے ہیں، اور کوئی سبق یہاں بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

مجھے ہزارہ وپشاور آپ کے ہمراہ جانا ہے، اس لیے ایک دو ہفتہ کے لیے آپ کو بلانا ہے، تو آپ انہیں مطلع کر دیں اور اسباق کو زیادہ پڑھا دیا کریں، تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو اور کسی کو گرانی وشکایت کا موقع نہ آئے۔

اگر ضرورت ہو تو مولانا سید احمد رضا صاحب کی امداد کے لیے مقامی وغیر مقامی دو تین آدمیوں کو متعین فرما دیں، تاکہ وہ کام سے فارغ ہو کر جلد یہاں آجائیں۔

مولانا احمد بزرگ صاحب، مولوی سید احمد رضا صاحب، اراکینِ مجلس احباب کو سلام، بچوں کو پیار ودعاء۔

والسلام

احقر محمد بن موسیٰ میاں عفا اللہ عنہما

شامتِ اعمال

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ
سابق مدیر ماہنامہ بینات واستاذِ حدیث، جامعہ

حق تعالیٰ شانہٗ نے انسان کی سعادت وشقاوت کو اس کے اعمال سے وابستہ فرمایا ہے، ہر عمل پر اس کے مناسب ردّعمل کا ظہور ہوتا ہے۔ بندوں کے جس قسم کے اعمال آسمان پر جائیں گے، اُنہی کے مناسب اُن کے حق میں آسمان سے فیصلے صادر ہوں گے۔ اعمالِ خیر پر خیر کے فیصلے آئیں گے اور اعمالِ شر پر دوسری نوعیت کے فیصلے ہوں گے۔ انفرادی اعمال پر افراد کے بارے میں شخصی فیصلے ہوں گے اور اجتماعی اعمال پر مجموعی طور پر قوم یا طبقہ کے بارے میں فیصلے ہوں گے۔ اعمال کے ثمرات ونتائج دنیا میں بھی رونما ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ہوں گے۔ اچھے اعمال پر جس طرح اُخروی سعادت مرتب ہوتی ہے، اسی طرح دنیا میں سعادت وکامرانی نصیب ہوتی ہے۔ اور گندے اعمال پر آخرت کی شقاوت وخسران کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی عذاب کی شکلیں نمودار ہوتی ہیں۔ نیک وبداعمال کے پورے نتائج کا ظہور تو آخرت میں ہوگا، کیونکہ کامل جزا وسزا کے لیے قیامت کا دن تجویز فرمایا گیا ہے، لیکن بطورِ نمونہ کچھ نتائج یا کم سے کم ان نتائج کی ہلکی سی جھلک دنیا میں بھی رونما ہوتی ہے، تاکہ معاملہ یکسر اُدھار پر نہ رہے، بلکہ کچھ تھوڑا سا نقد بھی دے دیا جائے۔

ہمارے یہاں جزا وسزا کے تصور میں دو غلطیاں بہت عام ہوگئی ہیں، قریباً سبھی عوام وخواص الا ماشاء اللہ! ان میں مبتلا نظر آتے ہیں:

ایک: یہ کہ اچھے بُرے اعمال کے نتائج قیامت میں ظاہر ہوں گے، اُسی وقت جزا وسزا بھی ہوگی۔ ہماری اس دنیوی زندگی کو نیک وبداعمال کی جزا وسزا سے کوئی تعلق نہیں۔ اس زندگی میں نیک وبد اعمال پر کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، نہ یہاں کسی کو اپنے کیے کی جزا یا سزا ملتی ہے۔

دوم: یہ کہ آخرت کی جزا وسزا پر اگرچہ ایمان ہے، لیکن خواہشات کے غلبہ وتسلُّط، غفلت آمیز ماحول کی تاریکی اور دنیوی لذّات کی حلاوت وشیرینی نے آخرت کی جزا وسزا کے تصور کو بہت ہی دھندلا اور مضمحل کردیا ہے۔ اس کا استحضار ہی نہیں رہتا کہ جو اعمال ہم اپنے نامۂ عمل میں درج کرارہے ہیں،

قیامت کے دن اُن کے ایک ایک ذرّہ کا حساب بھی دینا ہوگا:

''فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ'' (الزلزال:۷،۸)

ترجمہ:''سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا، وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا، وہ اس کو دیکھ لے گا۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اور جن گناہوں کا بوجھ ہم آج لاد رہے ہیں، کل اُسے خود اپنی ناتواں کمر پر اٹھانا ہوگا:

''وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ أَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ أَلَاسَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ'' (الانعام:۳۱)

ترجمہ:''اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے بار اپنی کمر پر لادے ہوں گے۔خوب سن لو! کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو لادیں گے۔'' (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

ہمارے طرزِ زندگی سے ایسا لگتا ہے کہ آخرت کی جزا وسزا کا ہمارے دنیوی اعمال سے کوئی ربط وتعلق نہیں، آخرت کا معاملہ اس دنیا سے یکسر بے تعلق ہے، ہم خواہ کیسے ہی عمل کرتے رہیں، ہم سے کوئی باز پُرس نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں، خود ہی معاف فرمادیں گے۔ ظاہر ہے کہ غفلت کی یہ کیفیت ہماری کھلی حماقت ہے، حدیث شریف میں ارشاد ہے:

''الكيّس من دان نفسهٗ وعمل لما بعد الموت، والعاجز من أتبع نفسهٗ هواها وتمنیٰ علی الله.'' (مشکوٰۃ،ص:۴۵۱)

ترجمہ:''ہوشیار اور عقلمند تو وہ ہے جس نے اپنے نفس کو رام کرلیا اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کیا اور احمق ہے وہ شخص جس نے نفس کو اس کی خواہشات کے پیچھے لگادیا اور اللہ تعالیٰ پر آرزوئیں دھریں۔''

الغرض ان دو غلطیوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہم اصلاحِ اعمال کی فکر سے بے نیاز ہیں، نہ اصلاحِ دنیا کے لیے اصلاحِ اعمال کی فکر ہے اور نہ اصلاحِ آخرت کے لیے۔

حکیم الامت حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ان ہی دو غلطیوں کی اصلاح کے لیے رسالہ''جزاء الاعمال'' تالیف فرمایا تھا، اس کی تمہید میں فرماتے ہیں:

''یہ ناچیز ناکارہ اپنے دینی بھائیوں کی خدمت میں عرض رساں ہے کہ اس وقت میں جو حالت ہم لوگوں کی ہے کہ طاعت میں کاہلی وغفلت اور معاصی میں انہماک وجرأت وہ ظاہر ہے۔ جہاں تک غور کیا گیا، اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ اعمالِ حسنہ وسیئہ کی پاداش صرف آخرت میں سمجھتے ہیں، اس کی ہرگز خبر تک نہیں کہ دنیا میں بھی اس کا کچھ نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور غلبۂ صفاتِ نفس کے سبب دنیا کی جزا وسزا پر چونکہ وہ سرِ دست واقع ہوجاتی ہے، زیادہ نظر

ہوتی ہے۔ پھر عالمِ آخرت میں بھی جزا وسزا کے وقوع کو گو عقیدۃً ان اعمال کا ثمرہ جانتے ہیں، مگر واقعی بات یہ ہے کہ جو علاقۂ قوی مؤثر واثر میں اور سبب ومسبب میں سمجھنا چاہیے اور اسباب ومسبباتِ دنیویہ میں سمجھتے ہیں، وہ علاقہ اس قوت کے ساتھ اعمال اور ان کے ثمراتِ آخرت میں ہرگز نہیں سمجھتے، بلکہ قریب قریب اس طرح کا خیال ہے کہ گویا اس عالم کے واقعات کا ایک مستقل سلسلہ ہے، جس کو چاہیں گے پکڑ کر سزا دے دیں گے، جس کو چاہیں گے خوش ہوکر نعمتوں سے مالا مال کر دیں گے۔ اعمال کو گویا اس میں کچھ دخل ہی نہیں ہے۔ (۱)

حالانکہ یہ خیال بے شمار آیات واحادیثِ صحیحہ کے خلاف ہے، چنانچہ عنقریب تفصیلاً معلوم ہوتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ!۔ اس لیے اس مرض کے دفع کرنے کے لیے دو امر ضروری خیال میں آئے:

اول: کتاب وسنت وملفوظاتِ محققین سے یہ دکھلا دیا جائے کہ جیسے آخرت میں اعمال پر جزا وسزا واقع ہوگی، ایسے دنیا میں بھی بعض آثار اُن کے واقع ہوئے ہیں۔

دوسرے: یہ ثابت کر دیا جائے کہ اعمال میں اور ثمراتِ آخرت میں ایسا قوی علاقہ ہے، جیسا آگ جلانے میں اور کھانا پکانے میں یا کھانا کھانے میں اور شکم سیر ہوجانے میں یا پانی چھڑکنے میں اور آگ کے بجھ جانے میں۔ ان دونوں امروں کے ثبوت کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید قوی ہے کہ سردست جزا اور سزا ہوجانے کے یقین سے اور اسی طرح کارخانۂ دنیا پر کارخانۂ آخرت کے مرتب ہونے کے غلبۂ اعتقاد سے طاعات میں رغبت اور معاصی سے نفرت پیدا ہوجانا سہل ہے۔ آئندہ توفیق وامدادِ حق تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہے۔''

قرآن کریم کی آیاتِ بینات اور آنحضرت ﷺ کے ارشاداتِ طیبہ میں اعمال کے دنیوی نتائج بہ کثرت مذکور ہیں، آج کی صحبت میں اس سلسلہ کی ایک حدیث ذکر کی جاتی ہے۔ مؤطا امام مالکؒ ''کتاب الجهاد باب ماجاء في الغلول'' میں حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا ہے:

''ما ظهر الغلول في قوم قط إلا ألقى في قلوبهم الرعب ولا فشئ الزنا في قوم إلا كثر فيهم الموت ولانقص قوم المكيال والميزان إلا قطع عنهم

(۱) فائدہ: کوئی شخص یہ شبہ نہ کرے کہ اعمال کا دخل نہ ہونا تو صحیح حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے، جس میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ: ''کوئی شخص عمل کے زور سے جنت میں نہ جاوے گا۔'' انتہیٰ۔ دفعیہ اس شبہ کا یہ ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عمل کو بالکل دخل ہی نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ عمل پر مغرور ہوکر نہ بیٹھ جاوے۔ جزوِ اخیر علّتِ تامّہ کا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، وبس! گویا یہ فضل بھی اعمالِ نیک سے نصیب ہوتا ہے، سو عمل ہی علّتِ تامہ کا ایک جزو ٹھہرا۔ قال اللہ تعالیٰ: ''إِنَّ رَحْمَتَ اللهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ '' انتہیٰ۔''

الرزق، ولا حکم قوم بغیر الحق إلا فشیٔ فیهم الدم، ولا ختر قوم بالعهد إلا سلط علیهم العدو.'' (مؤطا امام مالک، ص:۶۷۴۔ مؤطا امام محمد، ص:۳۶۹)

ترجمہ: ''جس قوم میں خیانت عام ہوجاتی ہے، اس کے دل میں رعب ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جس قوم میں زنا عام ہوجاتا ہے، ان میں اموات کثرت سے واقع ہونے لگتی ہیں۔ جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، ان کا رزق بند کردیا جاتا ہے۔ جو حق کے خلاف فیصلے کرتی ہے، اس میں خونریزی عام ہوجاتی ہے۔ اور جو قوم عہد شکنی کرتی ہے، ان پر دشمن کا تسلُّط ہوجاتا ہے۔''

اس حدیث میں جن پانچ گناہوں کے پانچ ہولناک نتائج ذکر کیے گئے ہیں، آج کا معاشرہ پوری طرح اُن کی لپیٹ میں ہے۔

❶ -غلول: مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی اس کا اطلاق مطلق خیانت پر بھی آتا ہے، جس کے مقابلہ میں دیانت داری اور امانت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ''امانت'' اور ''ایمان'' قرین ہیں اور خیانت ایمان کی ضد ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ خادمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''قلّما خطبنا رسول الله صلی الله علیه وسلم إلا قال: لا إیمان لمن لا أمانة لهٗ ولا دین لمن لا عهد لهٗ.'' (مشکوٰۃ، ص:۱۵)

ترجمہ: ''بہت کم ایسا ہوا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ نہ فرمایا ہو کہ ایمان ہی نہیں اس شخص کا جس کے لیے امانت نہیں اور دین ہی نہیں اس شخص کا جس کو اپنے عہد کا پاس نہیں۔''

دوسرے نصوص کے پیشِ نظر یہ حدیث اور اس نوعیت کی دیگر احادیث مؤوّل ہیں، یعنی اہلِ علم کے نزدیک ان میں اصل ایمان کی نفی نہیں، بلکہ کمالِ ایمان کی نفی مقصود ہے۔ تاہم بظاہر اس سے ایمان وخیانت کے درمیان جو ضدیت مفہوم ہوتی ہے، اس کو نمایاں کرنا مقصود ہے۔ الغرض ایمان دار معاشرہ خائن نہیں ہوتا اور نہ خائن معاشرہ اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں امانت ودیانت نام کی کوئی چیز ڈھونڈنے کو بھی نہیں ملتی، الا ماشاء اللہ!۔ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس میں خیانت وبددیانتی سرایت نہ کرگئی ہو؟ اور نجی اداروں یا سرکاری محکموں میں کونسا ادارہ اور کونسا محکمہ ایسا ہے جو اس گندگی سے محفوظ ہو؟ گزشتہ دنوں وفاقی محتسب کا بیان اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ:

''اب تک قومی بچت کے ادارے میں فراڈ کے ۱۷۹ واقعات ہوچکے ہیں اور کراچی کے ایک واقعہ میں غبن کی گئی رقم تین کروڑ سے زائد ہے اور ابھی جن کیسوں کو نمٹانا باقی ہے، ان کی تعداد ایک سو سے متجاوز ہے۔'' (روزنامہ جنگ، کراچی، ۸؍جولائی ۱۹۸۷ء)

یہ صرف ایک ادارے کے اُن واقعات کے اعداد وشمار ہیں جن کی شکایت وفاقی محتسب تک پہنچ سکی ہے۔ اس سے ہمارے معاشرے میں دیانت وامانت کے معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''قیاس کن زِ گلستان من بہارِ مُرا''

آج کل اخبارات میں اینٹی کرپشن کمیٹی کے چیئر مین کے بڑے دھواں دار بیانات اخبارات میں آرہے ہیں۔ خدا کرے یہ کمیٹی صورت حال کی اصلاح میں کسی حد تک کامیاب ہوجائے اور دیگر بہت سی کمیٹیوں اور اداروں کی طرح یہ خود ہی کرپشن کا شکار نہ ہوجائے۔ اسی بڑھی ہوئی خیانت وبددیانتی کا نتیجہ ہے کہ امن وامان مفقود ہے، ہر شخص پر خوف وہراس کی کیفیت طاری ہے۔ اس بدامنی سے نہ گھر محفوظ ہیں، نہ سڑکیں، نہ بازار، نہ دفاتر، نہ کالج، نہ جامعات، نہ مدارس، نہ مساجد، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

اس بددیانتی وخیانت کی فراوانی کا اصل سبب یہ ہے کہ کسی شخص کا کسی عہدہ ومنصب کے لیے انتخاب کرتے ہوئے اس کی تعلیم، سند اور ڈگری کو (یا پھر سفارش ورشوت کو) معیار بنایا جاتا ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ اس شخص کے دین ودیانت اور ایمان وامانت کا معیار کیا ہے؟

❷ - حدیث کا دوسرا فقرہ یہ ہے کہ جس قوم میں زنا عام ہوجاتا ہے، اس میں اموات بہ کثرت واقع ہوتی ہیں۔ زنا کے عام ہوجانے میں اُس کے اسباب کو بڑا دخل ہے۔ ہمارے معاشرے میں زنا کے اسباب اس قدر عام ہیں کہ بھلے زمانوں میں اُن کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ عورتوں کی بے حجابی وعریانی، لڑکوں، لڑکیوں کی مخلوط تعلیم، مرد وزن کا بے حجابانہ اختلاط، ہر شعبۂ زندگی میں مرد وعورت کے دوش بدوش چلنے اور چلانے کا جنون، رومانی فلمیں اور فیچر، ہیجان انگیز گانے اور نغمے۔ الغرض اسبابِ زنا کا ایک طوفان ہے، جس میں قوم گلے گلے تک ڈوب رہی ہے اور اس طوفان کی قوت وشدت روز افزوں ہے۔ اس طوفان کو دیکھ کر نوجوان نسل بزبانِ حال یہ کہہ رہی ہے:

درمیانِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش!

سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ نوخیز نسل جس کو صنفِ مخالف سے اختلاط کی تمام سہولتیں حاصل ہوں اور اس اختلاط کی راہ میں اُن پر کوئی پابندی عائد نہ ہو، اُس سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی عفت وعصمت کو آلودگی سے بچانے میں کامیاب ہوجائے؟! لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللهِ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ.

ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ناخدایانِ قوم کو نسلِ جدید کی ان مشکلات کا کوئی احساس نہیں اور نہ اُسے اس طوفانِ نوح سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کبھی زیرِ غور آتی ہے، بلکہ بہت سے قلم، جن کی آواز مؤثر ہے اور جو مسکین خود بادۂ جنسیت کے مئے گسار ہیں، وہ ''آزادیِ نسواں'' کا علم اٹھائے اس صورت حال کو مزید

سنگین بنانے میں مصروف ہیں۔ چند بڑے گھرانے کی ''بیگمات'' ان کی آلۂ کار ہیں اور ناخدایانِ قوم ان بیگمات کے اشارۂ چشم وابرو پر رقص کرنے کو عین سعادت اور ''صحیح خدمتِ اسلام'' سمجھتے ہیں۔ انصاف فرمائیے! کیا یہ کسی اسلامی معاشرہ کے خدّ وخال ہیں؟ اور جو معاشرہ اس طرح ''جنسی وبا'' کی لپیٹ میں آجائے، اس میں نت نئے امراض کا ظہور اور کثرتِ اموات کا وقوع اس صورت حال کا فطری نتیجہ ہے۔

❸ - حدیث کا تیسرا فقرہ ہے کہ جو قوم ناپ تول میں کمی کرتی ہے، وہ رزق کی بندش کے عذاب میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ ''ناپ تول میں کمی'' کا مفہوم عام ہے کہ جس مقدار کی تعیین کے لیے جو پیمانہ مقرر ہے، اُسے پورا نہ کیا جائے اور صاحبِ حق کا حق پورا ادا نہ کیا جائے۔ حضرت اقدس مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ''معارف القرآن'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن وحدیث میں ناپ تول میں کمی کرنے کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ عام طور سے معاملات کا لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ انہی کے ذریعہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حق دار کا حق ادا ہوگیا یا نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ مقصود اس سے ہر ایک حق دار کا حق پورا پورا دینا ہے، اس میں کمی کرنا حرام ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر وہ چیز جس سے کسی کا حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے، اس کا یہی حکم ہے، خواہ ناپ تول سے ہو یا عدد شماری سے یا کسی اور طریقے سے، ہر ایک میں حقدار کے حق سے کم دینا بحکمِ تطفیف حرام ہے۔ مؤطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع سجدے وغیرہ پورے نہیں کرتا، جلدی جلدی نماز ختم کرڈالتا ہے تو اس کو فرمایا: ''لقد طففت'' یعنی تو نے اللہ کے حق میں تطفیف کردی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس قول کو نقل کرکے حضرت امام مالکؒ نے فرمایا: ''لکل شيء وفاء وتطفیف'' یعنی پورا حق دینا یا کم کرنا ہر چیز میں ہے، یہاں تک کہ نماز، وضو، طہارت میں بھی اور اسی طرح حقوق اللہ اور عبادات میں کمی کوتاہی کرنے والا تطفیف کرنے کا مجرم ہے۔ اسی طرح حقوق العباد میں جو شخص مقررہ حق سے کم کرتا ہے، وہ بھی تطفیف کے حکم میں ہے۔ مزدور، ملازم نے جتنے وقت کی خدمت کا معاہدہ کیا ہے، اس میں سے وقت چُرانا اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے۔ وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف میں معمول ہے، اس میں سستی کرنا بھی تطفیف ہے۔ اس میں عام لوگوں میں، یہاں تک کہ اہلِ علم میں بھی غفلت پائی جاتی ہے، اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو کوئی گناہ ہی نہیں سمجھتا۔ أعاذنا اللہ منہ.'' (معارف القرآن، ج:۸، ص: ۶۹۳، ۶۹۴)

''ناپ تول میں کمی'' اور حقوق ادا کرنے کے جو پیمانے مقرر ہیں، ان کو پورا نہ کرنے کی بیماری بھی ہمارے معاشرے میں عام ہے، جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ ہزاروں میں کوئی ایک ہوگا جو مقررہ پیمانے کو پورا ادا نہ کرنے کا مریض نہ ہو، یہی

وجہ ہے کہ اس کی سزا یعنی رزق کی بندش بھی عام ہو رہی ہے۔ رزق کی بندش کی بھی بہت سی صورتیں ہیں: ایک یہ کہ رزق کا قحط ہو جائے۔ ایک صورت یہ ہے کہ چیزوں کی تو فراوانی اور بہتات ہو، مگر صارفین کی قوتِ خرید میں کمی واقع ہو جائے۔ ایک صورت یہ ہے کہ رزق سے برکت اُٹھ جائے اور (الا ماشاء اللہ!) ہر شخص کو قلتِ وسائل کی شکایت ہو۔

غور فرمایئے! تو ہمارے یہاں ''بندشِ رزق'' کی یہ ساری صورتیں پائی جاتی ہیں اور رزق کے معاملے میں معاشرے کی اکثریت حیران و پریشان ہے۔ بے روزگاری عام ہو رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں نوجوان نسل منفی جذبات کی آماجگاہ بن رہی ہے۔ معمولی سی بات پر لڑائی جھگڑا، قتل وقتال اور قومی اَملاک کی توڑ پھوڑ گویا روزمرہ کا معمول بن رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہ ہوگا جو اس نوعیت کے ناخوشگوار واقعات سے خالی گزرتا ہو۔ حضرت مفتی صاحب ''قطعِ رزق'' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حدیث میں جن لوگوں کا رزق قطع کر دینے کا ارشاد ہے، اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کو رزق سے بالکل محروم کر دیا جائے اور یہ صورت بھی قطعِ رزق ہی میں داخل ہے کہ رزق موجود ہوتے ہوئے وہ اس کو کھا نہ سکے یا استعمال نہ کر سکے، جیسے بہت سی بیماریوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے اور اس زمانے میں بہت عام ہے۔ اسی طرح قحط کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ اشیاء ضرورت مفقود ہو جائیں اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موجود بلکہ کثیر ہونے کے باوجود ان کی گرانی اتنی بڑھ جائے کہ خریداری مشکل ہو جائے، جیسا کہ آج کل اس کا مشاہدہ اکثر چیزوں میں ہو رہا ہے۔ اور حدیث میں فقر مسلط کرنے کا ارشاد ہے، اس کے معنی صرف یہی نہیں کہ روپیہ، پیسہ اور ضرورت کی اشیاء اس کے پاس نہ رہیں، بلکہ فقر کے اصل معنی محتاجی اور حاجت مندی کے ہیں۔ ہر شخص اپنے کاروبار اور ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کا جتنا محتاج ہو، وہ اتنا ہی فقیر ہے۔ اس زمانے کے حالات پر غور کیا جائے تو انسان اپنے رہن سہن اور نقل وحرکت اور اپنے ارادوں کے پورا کرنے میں ایسے ایسے قوانین میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے کہ اس کے لقمہ اور کلمہ تک پر پابندیاں ہیں۔ اپنا مال موجود ہوتے ہوئے خریداری میں آزاد نہیں کہ جہاں سے چاہے کچھ خریدے، سفر میں آزاد نہیں کہ جب کہیں جانا چاہے چلا جائے۔ ایسی ایسی پابندیوں میں انسان جکڑا گیا ہے کہ ہر کام کے لیے دفتر گردی اور افسروں سے لے کر چپڑاسیوں تک کی خوشامد کیے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہے۔ یہ سب محتاجی ہی تو ہے، جس کا دوسرا نام فقر ہے۔ اس تفصیل سے وہ شبہات رفع ہو گئے جو حدیث کے ارشاد کے متعلق ظاہری حالات کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں۔'' (معارف القرآن، ج:۸،ص:۶۸۴، ۶۹۵)

❹ - حدیث کا چوتھا فقرہ یہ ہے کہ جو قوم حق کے خلاف فیصلے کرتی ہے، اس میں قتل وخونریزی عام ہو جاتی ہے۔ ''حق کے مطابق فیصلہ'' کرنے کا مطلب ہے: ''صحیح قانون کے مطابق صحیح فیصلہ کرنا''

گویا اس کے مفہوم میں دو چیزیں شامل ہیں: ایک یہ کہ قانون کے مطابق بےلوث فیصلہ کیا جائے، جس میں نہ کسی کی رورعایت ہو، نہ لالچ یا سفارش کارفرما ہو۔ دوم یہ کہ جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا گیا، وہ قانون بھی بجائے خود صحیح اور برحق ہو۔ پس اگر قانون ہی غلط ہو، ظالمانہ ہو تو اس کے مطابق جو فیصلہ بھی کیا جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل وانصاف کا فیصلہ نہیں ہوگا اور ایسے فیصلے کرنے والا ''ناحق فیصلہ'' کی وعید کا مستحق ہوگا، وہ قیامت کے دن یہ عذر نہیں کر سکے گا کہ میں نے قانون کے مطابق فیصلہ کیا تھا۔ اسی طرح اگر قانون تو صحیح اور برحق ہے، مگر فیصلہ کرنے والے نے قانون کے مطابق بےلوث اور بےلاگ فیصلہ نہیں کیا، بلکہ رشوت وسفارش یا قرابت کی وجہ سے ایک فریق کی رعایت کی گئی تو یہ فیصلہ بھی ظالمانہ اور جابرانہ فیصلہ ہوگا۔

بدقسمتی سے ہمارے یہاں ''حق کے مطابق فیصلہ'' کی دونوں شرطیں مفقود ہیں۔ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک ہمارے یہاں انگریز کا قانون بعض جزوی ترمیمات کے ساتھ نافذ ہے اور ہماری عدالتیں (اگر ان کو عدالت کہنا صحیح ہے) اسی کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند ہیں۔ گویا ہمارے یہاں عدالتوں میں ''مَآ أَنْزَلَ اللّٰہُ'' کے بجائے ''ما أنزل الانکلیز'' کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔

اور پھر جس قسم کا قانون بھی نافذ ہے، صحیح یا غلط فیصلے اس کے مطابق نہیں ہوتے، بلکہ رشوت وسفارش کے مطابق فیصلے ہوتے ہیں۔ رشوت وسفارش کا طوفان قانون کی حکمرانی کو بہا کر لے گیا ہے، چنانچہ قانون ظالم سے مظلوم کو حق دلانے سے قاصر ہے، اس کی حیثیت منڈی کے بکاؤ مال کی ہے کہ جو شخص بھی اس کے زیادہ دام لگائے، قانون اس کی چاکری کے لیے حاضر ہے، کسی دانا کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ:

''قانون مکڑی کا جالا ہے، یہ کمزور کو پھانس لیتا ہے اور طاقت ور اُسے توڑ دیتا ہے۔''

ان دو چیزوں کے علاوہ موجودہ عدالتی نظام اتنا پیچیدہ اور اتنا مہنگا ہے، عام آدمی اس سے دادرسی کی کوئی توقع نہیں رکھتا، بلکہ عدالت کے لفظ ہی سے پناہ مانگتا ہے اور اگر عدالت سے رجوع کرنا ہی پڑے تو حصولِ انصاف کے طول وطویل راستے کو اپنی زندگی میں قطع کرنے کی اُسے کوئی توقع نہیں ہوتی۔ دیوانی مقدمات میں زیادہ تر فیصلہ باپ کے بجائے بیٹے کی زندگی میں ہوتا ہے اور بسا اوقات دادا کے مقدمہ کا فیصلہ پوتے کو سنایا جاتا ہے۔ فوجداری مقدمات میں بھی سالہا سال تک جیلوں میں پڑے سڑتے رہتے ہیں اور عدالت ایک طویل عرصے کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ وہ مجرم ہیں یا بےقصور؟ اور بےقصور ہونے کی صورت میں اُنہیں عدالت کے دروازے پر انصاف کی بھیک مانگنے کے جرم میں طویل عرصہ جیل کی ہوا کھانی پڑتی ہے۔ الغرض ہمارے موجودہ عدالتی نظام میں اول تو وہ قانون ہی (الا ماشاء اللہ!) غلط اور ناحق ہے، جس کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔

دوسرے: یہ عدالتی فیصلے اکثر و بیشتر بے لَوث نہیں، بلکہ رشوت وسفارش یا دوستی وقرابت کی بنا پر کیے جاتے ہیں۔

تیسرے: انصاف مفت تو کیا، سستا بھی مہیا نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں انصاف ایسی گراں جنس ہے کہ غریب آدمی کی دسترس سے باہر ہے۔

چوتھے: یہ عدالتی نظام ایسا پیچ در پیچ ہے کہ دادرسی کے طالب کا پیمانۂ عمرلبریز ہوجاتا ہے اور وہ قیدِ حیات سے رہائی حاصل کرلیتا ہے، وہ عدالت اُسے انصاف دلانے سے قاصر رہتی ہے۔ یہ تمام تر صورتِ حال ظلم در ظلم، در ظلم، در ظلم کی ہے، جس کی چکی میں ''انصاف کے نام'' پر معاشرہ پس رہا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قانون کا احترام اُٹھ گیا ہے اور قانون کو ہاتھ میں لینے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں اَنارکی، افراتفری، فتنہ وفساد اور قتل وغارت کے لاوے پھوٹ رہے ہیں۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس کا نقشہ حدیث شریف میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ:

''جب کوئی قوم ناحق فیصلے کرتی ہے تو اُن میں خونریزی عام ہوجاتی ہے۔''

حدیث شریف کا پانچواں فقرہ عہد شکنی سے متعلق ہے کہ جب کوئی قوم اپنے کیے ہوئے معاہدوں کا پاس نہیں کرتی، بلکہ عہد شکنی کا ارتکاب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اُس پر دشمن کو مسلط کردیتے ہیں۔ اس سے غالباً وہ سرکاری معاہدات مراد ہیں جو غیر قوموں کے ساتھ کیے جاتے ہیں۔ عہد شکنی بجائے خود ایک بدترین جرم ہے، لیکن غیر قوموں کے ساتھ کیے گئے معاہدات میں عہد شکنی کرنا اس جرم کو اور زیادہ سنگین کردیتا ہے اور بالآخر یہ عہد شکنی مسلمانوں کی ذلت ورسوائی اور اُن پر دشمن کے تسلُّط کا سبب بن جاتی ہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلك.

خلاصہ یہ کہ آج ہم جن پریشانیوں میں مبتلا ہیں، وہ ہماری شامتِ اعمال کا نتیجہ ہیں۔ اس صورتِ حال کو نہ تو کانفرنسوں اور جلسوں کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے، نہ حکومت کی تبدیلی اس کا حل ہے، نہ انتخاب، نہ پارلیمنٹ۔ ان پریشانیوں کے ازالہ کی بس ایک صورت ہے کہ ہم اپنی بدعملیوں سے توبہ کریں اور اصلاحِ احوال کے لیے اصلاحِ اعمال کا راستہ اختیار کریں۔ حق تعالیٰ شانہٗ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، ہماری کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف فرمائیں اور اعمالِ صالحہ اختیار کرنے کی صورت میں جس ''حیاۃِ طیبۃ'' کا وعدہ فرمایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں بھی نصیب فرمائیں۔

وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد النبي الأمي نبي الرحمۃ وعلی آلہٖ وأصحابہٖ وأتباعہٖ أجمعین

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

اسلامی اذکار اور دعائیں!

احکام و فضائل

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ
سابق مُشرف تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

روحانی زندگی کی بقا و اصلاح

انسان کی روحانی زندگی کی بقا و اصلاح کے لیے دو چیزوں کی اصلاح نہایت ضروری ہے:

❶-صحتِ عقیدہ ❷-صحتِ عمل

انسان ان دونوں چیزوں کی اصلاح میں درماندہ و عاجز ہے، کیونکہ بُرے کاموں سے بچنا اور نیک کام کرنا اللہ تعالیٰ کی نصرت و ہدایت کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس لیے شریعت نے تعوُّذ اور بسم اللہ کی تعلیم دی ہے اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنے کے لیے ادعیہ واذکار کا ایک مستقل نظام قائم کیا، جو روحانی ترقی کا نہایت مؤثر اور اہم ذریعہ ہے۔ اسلامی عبادات کا مرکز ومحور ''ذکر اللہ'' ہے، اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے اہم رکن نماز ہے، قرآن نے اس کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

''وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ'' (طٰہٰ:۱۴) یعنی ''میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔''

اقامتِ صلوٰۃ کا مقصد یادِ الٰہی کو دل میں تازہ رکھنا ہے۔ اسی طرح اسلام کا اہم رکن حج ہے، اُس کا آغاز ہی تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید سے ہوتا ہے۔ طواف وعمرہ اذکار وادعیہ پر مشتمل ہیں۔ حج کا اہم رکن قیامِ عرفات ہے، اس میں سارا زور اذکار وادعیہ پر دیا گیا ہے، اس کے لیے میدانِ عرفات میں نماز میں تقدُّم وتاخُّر کیا گیا ہے، جس سے اسلام میں اس کی اہمیت ظاہر و باہر ہے۔

قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کی دعاؤں کے الفاظ کو نقل کیا، اُن کے دعا مانگنے کے اسلوب اور طور طریقہ کو بیان کیا، دعا کے آداب کی طرف رہنمائی کی، نیز اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ دعا بنی نوعِ

انسان کا ایک فطری عمل ہے جو آڑے وقت اور مشکلات میں پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔ شریعت چاہتی ہے کہ یہ فطری عمل عیش وطیش، رنج وراحت، سود وزیاں، خوشی وناخوشی، نرمی وگرمی، تنگدستی وخوشحالی، عزّت وذلّت ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔

دعا اپنے خالق ومالک سے براہِ راست تعلق وقرب کا نہایت کامیاب اور سب سے زیادہ زوداثر اور نہایت مجرب عمل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں دعا مانگنے کا حکم دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ ستودہ صفات جو مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے اور اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ ''دعا'' آپ ﷺ کی زندگی کا نہایت روشن باب ہے۔ آپ ﷺ کی ادعیۂ ماثورہ اصحابِ فکر ونظر وارباب صدق وصفا کا نظری وعملی دونوں اعتبار سے نہایت پسندیدہ موضوع رہی ہیں۔

مفسّرین، محدثین، فقہاء ومتکلمین، صوفیاء واُدباء، ائمہ لغت، مؤرخین اور سیرت نگاروں نے اس موضوع سے اعتنا کیا، چنانچہ کسی نے رسالت مآب ﷺ کی دعاؤں کو اپنی سندوں سے جمع کیا۔ کسی نے ان کے مطالب ومعانی کی وضاحت کی اور موقع ومحل کو بیان کیا۔ کسی نے توبہ واستغفار پر کلامی نقطۂ نظر سے بحث کی۔ کسی نے مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق کی۔ کسی نے ان کی نحوی ترکیب سے اعتنا کیا۔ کسی نے اس امر پر روشنی ڈالی کہ حضور اکرم ﷺ نے نماز میں کیا کیا دعائیں مانگیں، حج میں کس موقع پر کن الفاظ میں اللہ کے حضور التجا کی، نمازِ جنازہ وتشہد وتہجد میں کیا کیا دعائیں رسولِ خدا ﷺ سے منقول ہیں، جنگ وغزوات میں کس موقع پر کن الفاظ میں اپنے رب کو یاد کیا، خوشی کے موقع پر اپنے رب کو کن الفاظ میں پکارا اور مصیبت میں کن الفاظ سے اِلتجا کی۔ صوفیاء نے اپنے تجربات والہامات سے ان دعاؤں کو اَحزاب واَوراد میں تقسیم کیا، جو اَحزاب واَوراد کے نام سے معروف ومشہور ہیں۔ بعض نے ان کے خواص واثرات کو موضوعِ بحث بنایا، اور اس موضوع پر کتابیں تالیف کیں۔ کسی نے دعا کی حقیقت کو بتایا اور اس کی قبولیت کی شرائط پر روشنی ڈالی۔ اس طرح دعا کے گوناگوں پہلو زیرِ بحث آتے رہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں ادعیہ واذکار کے نظام کو نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ کتبِ حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے جن الفاظ سے دعائیں اور اذکار حدیث کی کتابوں میں منقول ہیں، وہ سب الہامی اور توقیفی ہیں۔ ان الفاظ سے مانگنا اجر وثواب کا موجِب اور بارگاہِ الٰہی میں سب سے زیادہ محبوب ومقبول ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی: ۹۱۱ھ) نے ''تدريب الراوي'' میں تصریح کی ہے کہ دعائیں توقیفی (الہامی) ہیں: ''ألفاظ الأذكار توقيفية.'' (ص:۴۰۶) ترجمہ: ''اذکار اور دعاؤں کے الفاظ الہامی ہیں (یعنی اُنہی الفاظ میں اُنہیں پڑھنا چاہیے)۔''

ذکر ودعا پر اطمینانِ قلب کا الٰہی وعدہ

اس دور میں جہاں ہر طرف سامانِ عیش وطرب کی فراوانی ہے، خوش دلی وخوش حالی کا سامان بکثرت موجود اور بآسانی دستیاب ہے، زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہیں کشادہ ہیں، پھر بھی دنیا میں ہر جگہ معاشرہ گھٹن کا شکار ہے، اور اطمینانِ قلب کی دولت کا کہیں سراغ نہیں، اس کے حصول کے لیے اجتماعی اور انفرادی جو بھی کوشش ممکن ہے برابر جاری ہے، لیکن تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ اسلام کے نظامِ اذکار وادعیہ سے بے رغبتی، غفلت اور دوری ہے۔ دنیا میں غفلت ودوری کا یہ پردہ ہی وہ پردہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور یادِ الٰہی سے دور رکھتا ہے، دینِ حق قبول کرنے، دعوتِ حق کو سننے سے مانع ہے، اور آخرت میں انسان کو جہنم کا ایندھن بناتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا'' (الکہف:۱۰۱)

ترجمہ: ''جن کی آنکھوں پر (دُنیا میں) میرے ذکر کی طرف سے پردہ پڑا ہوا تھا، اور جو سُننے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔''

معلوم ہوا کہ اللہ کی یاد ہی وہ بنیاد ہے جس سے بندے کا رشتہ اللہ سے جڑتا اور قائم رہتا ہے، قرآن کہتا ہے:

''اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ'' (الرعد:۲۸)

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، اور جن کے دِل اللہ کے ذکر سے اطمینان حاصل کرتے ہیں، یاد رکھو کہ صرف اللہ کا ذکر ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔''

ذکر کے بھی درجات ہیں، جس درجہ کا ذکر ہوتا ہے، اُسی درجہ کا اطمینان ہوتا ہے، ذکر کی خاصیت ہی اطمینانِ قلبی ہے۔ جو ذکر اللہ سے جُڑتا اور استوار ہوتا ہے، اُس کا ہر لمحہ عبادت میں گزرتا اور وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے۔ یہ اسلام کا ایسا نظریۂ حیات ہے، جس کی مثال عالم کے مذاہب میں ملنی مشکل ہے۔ اس نظام کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے کہ بندہ کی زبان ہمہ وقت ذکر اللہ سے تر رہتی، دل اللہ کی یاد سے آباد اور قناعت وغنا کی دولت سے ہمیشہ سرشار رہتا ہے۔ سخت سے سخت گھڑی اور کٹھن سے کٹھن منزل پر جزع و فزع، گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہوتی، اس کا سکون واطمینان برقرار رہتا ہے، اس لیے کہ اس کا دل اور زبان یادِ الٰہی سے معمور ہے۔ اذکار وادعیہ کا اسلامی نظام اس نوع کی زندگی بناتا اور سنوارتا ہے کہ ہر لمحہ اور ہر آن عبادت میں گزرتا اور وہ اطمینانِ قلب کی لذت سے لطف اندوز ہوتا رہتا ہے۔

عالمِ اسباب میں دُعا

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے، یہاں ہر کام کسی وجہ سے ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر کام سلسلۂ اسباب کی ایک کڑی ہے، ہر ایک واقعہ کا کوئی نہ کوئی سبب ہے، اِس کا انکار گویا قانونِ فطرت کا انکار ہے۔ البتہ اسباب کی پابندی سے کامیابی کا یقین نہیں ہوتا۔ اسباب بذاتہا اگر مؤثر ہوتے تو مطلوبہ نتیجہ ضرور حاصل ہوتا، ایسے ہی موقع پر انسان اپنے آپ کو عاجز پاکر مسبب الاسباب کی طرف لوٹتا اور اُسے پکارتا ہے، اور وہ اس کی مراد کو پورا کرتا ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ کائنات کا سارا نظام اللہ کے علم وارادہ اور قدرت وحکمت کے ماتحت چل رہا ہے۔

دُعا ایک تدبیر وسبب ہے، اور سنت اللہ اس طرح جاری ہے کہ اسباب کے بغیر مطلوب حاصل نہیں ہوتا، گو اس کی قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ کبھی وہ سبب کے بغیر بھی مراد بَر لاتا ہے، مگر ایسا بھی اس کی حکمت ومصلحت سے ہوتا ہے۔ سلسلۂ سبب ومسبب کا نام حکمت ہے۔

اُمّتِ مسلمہ کا مذہب یہ ہے کہ ''دُعا''، ''توکل'' اور ''عملِ صالح'' دنیا وآخرت کے مقاصد کے حاصل کرنے میں ایک سبب کی حیثیت رکھتے ہیں اور معاصی سے بچنے کا ذریعہ ہیں۔ جو حکم کسی سبب سے وابستہ ہوتا ہے، اس کے پورا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی شرائط کو پورا کیا جائے، اور موانع اور رکاوٹوں کو دور کیا جائے، پھر مسبَّب پایا جائے گا، ورنہ نہیں۔

نظامِ عبادت میں اذکار اور دعائیں

اسلام میں ادعیہ واذکار کا نظامِ عبادت دوسری اسلامی عبادات کی طرح مخصوص شرائط، اوقات ومقامات کے ساتھ وابستہ اور خاص نہیں ہے، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد وغیرہ میں وقت، مقام، ہیئت اور شرائط ضروری قرار دی گئی ہیں، اس طرح کی شرائط اذکار اور دعاؤں کے نظام میں لازمی اور ضروری نہیں۔ ابن ابی حاتمؒ، ابن المنذرؒ اور ابن جریرؒ نے بواسطۂ علی بن ابی طلحہ الہاشمیؒ (متوفی: ۱۴۵ھ) ترجمان القرآن حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ترجمہ: '' اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر کوئی عبادت فرض نہیں کی، مگر اس کے لیے حد مقرر ومتعیّن کی ہے (یہ مقررہ حد وقت، مقام، ہیئت وشرائط سے عبارت ہے)، پھر حالتِ عُذر میں انہیں مہلت دی ہے، سوائے ذکر ودعا کے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر ودعا کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی جس پر وہ ختم ہوتی ہو، اور اُسے چھوڑ دینے میں کسی کو معذور قرار نہیں دیا، مگر اس کو جو اپنی عقل وفہم ہی کھو بیٹھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: ''اُذْكُرُوا اللهَ قِيَامًا

وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ '' کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرو۔ رات میں، دن میں، خشکی میں، سمندر میں، سفر میں، وطن میں، تنگدستی میں، تونگری میں، تندرستی میں، بیماری میں، چھپے اور کھلے، ہر حال میں اللہ کا ذکر کرو، اس سے دُعا مانگو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں دو قسم کی عبادات ہیں: ایک وہ عبادات ہیں جو خاص وقت، خاص مقام، خاص ہیئت اور خاص شرائط کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ دوسری وہ عبادات ہیں جن میں اس نوع کی کوئی شرط وقید نہیں، یہ اذکار اور دعائیں وہ ہیں جن کا نفع عام وتام ہے۔

دُعا کے معنی

دُعا کے معنی لُغت میں بُلانا، پُکارنا، یاد کرنا ہیں، لیکن عرف اور شریعت میں اس سے خاص معنی مُراد ہیں۔ علّامہ سیّد مرتضیٰ بلگرامی ثم زبیدیؒ ''تاج العروس'' میں رقم طراز ہیں:

''الدعاء: الرغبة إلى الله فيما عندهٗ من الخير، والابتهال إليه بالسؤال، ومنه قولهٗ تعالٰى: ''اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۔اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔'' (الاعراف:۷)

ترجمہ: ''دُعا کے معنی: اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ خیر اور بھلائی ہے اس کی خواہش ورغبت کرنا اور اس کے سامنے عاجزی ونیازمندی سے سوال کرنا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اپنے پروردگار سے دُعا کرو عاجزی کے ساتھ چُپکے چُپکے، بے شک وہ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

دُعا میں مُراد کا حاصل ہونا بھی مطلوب ومقصود ہوتا ہے، اس لیے اس کے جواب میں اِجابت کا لفظ آتا ہے کہ جس مقصد کے لیے درخواست کی گئی تھی وہ قبول ہوگئی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ۔'' (المؤمن:۶۰)

ترجمہ: ''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری درخواست قبول کروں گا۔''

حقیقتِ دُعا

امام فخر الدین رازیؒ تفسیرِ کبیر، ج:۲، ص:۹۲۱ میں لکھتے ہیں:

''حقيقة الدعاء استدعاء العبد ربهٗ جلّ جلاله العناية و استمدادهٗ إياه المعونة.''

ترجمہ: ''دُعا کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب سے مدد اور رحمت وعنایت کا طلبگار رہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ دعا کے مفہوم میں بہت وسعت ہے، اپنے دینی و دنیوی مطالب، زبان سے، دل سے، یا حال سے پیش کرنا، تسبیح وتہلیل کرنا، یادِ الٰہی میں لگے رہنا بھی دعا کے مفہوم میں داخل ہے۔ اصل عبادت یہ ہے کہ بندہ کی ہر ادا سے یہ ظاہر ہوتا رہے کہ یہ بندہ ہے اور وہ رب ہے، یہ مخلوق ہے اور وہ خالق ہے، یہ محتاج ہے وہ غنی ہے، یہ عاجز ہے وہ قادر ہے، جو اس امر سے گریز کرتا ہے وہ دُعا کو مؤثر نہیں سمجھتا اور نہ وہ اپنے آپ کو ''عبد'' اور ''رب الأرباب'' کو ''رب'' مانتا ہے، اس کی سزا جہنّم ہے۔ قرآن کہتا ہے:

''وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ '' (المؤمن:۵۹)

ترجمہ: ''اور تمہارے پروردگار نے کہا ہے کہ: مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، بے شک جولوگ تکبر کی بنا پر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، وہ ذلیل ہوکر جہنّم میں داخل ہوں گے۔''

حدیث میں آتا ہے: ''الدعاء هو العبادة.'' (ق، ع) یعنی ''دعا اصلِ عبادت ہے۔'' اور دوسری حدیث میں آیا ہے: ''الدعاء مخ العبادة.'' یعنی ''دُعا مغزِ عبادت ہے۔''

اہلِ سنت (اشاعرہ وماتریدیہ) کا دعا کے متعلق عقیدہ

دُعا کی اہمیت وافادیت کو اور اس حقیقت کو کہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیّت وارادہ میں آزاد ہے، تسلیم کرتے اور اس امر کے قائل ہیں کہ دُعا کو قبول کرنا اور اس کا رد کرنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ ان کے یہاں نمازِ جنازہ کی حیثیت ایک دُعا کی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی التجا کی جاتی ہے اور مغفرت اُس کی رضا پر موقوف ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ دُعا کی اہمیت وافادیت کو مانتے ہیں۔ انہی وجوہ سے وہ کسی جائز سبب کی وجہ سے بددُعا کی ضرر رسانی سے انکار نہیں کرتے، وہ اس امر کے قائل ہیں کہ مظلوم کی بددُعا قبول ہوتی ہے، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔

انفرادی واجتماعی دعا کی اقسام

دعائیں بھی دو قسم کی ہیں: ❶-انفرادی ❷-اجتماعی

❶-انفرادی دعائیں: وہ دعائیں ہیں جن میں واحد متکلم کے صیغے اور ضمیریں استعمال کی گئی ہیں۔ ان کا تعلق فردِ واحد کی اپنی اصلاح وفلاح، کامیابی وکامرانی، حاجت روائی وکاربرآری اور مغفرت و معافی سے ہے۔

❷-اجتماعی دعائیں: وہ دعائیں ہیں جن میں جمع متکلم کے صیغے اور ضمیریں آتی ہیں، ان دعاؤں میں اجتماعی شان مضمر ہے، پوری اُمت اس میں شریک ہوتی ہے، اسلامی معاشرہ کے تمام افراد اس میں داخل ہیں۔

حیثیت کے اعتبار سے دعا کی چار قسمیں

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے دعا کی چار قسمیں بیان کی ہیں، موصوف فرماتے ہیں:

''دعا کی چار قسمیں ہیں: **اول:** دعائے فرض، مثلاً نبی کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کے لیے ہلاکت کی دعا کرے، بس اسے یہ دعا کرنا فرض ہے۔ **دوم:** دعائے واجب، جیسے دعائے قنوت۔ **سوم:** دعائے سنت، جیسے بعدِ تشہد اور ادعیہ ماثورہ۔ **چہارم:** دعائے عبادت، جیسا کہ عارفین کرتے ہیں اور اس سے محض عبادت مقصود ہے، کیونکہ دعا میں تذلّل (عجز و انکساری کا اظہار) ہے اور تذلّل حق تعالیٰ کو محبوب ہے۔

نظامِ اذکار وادعیہ کی غایت

نظامِ اذکار وادعیہ کی غایت یہ ہے کہ ''اللہ کا ذکر'' اللہ کی یاد اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے دل ودماغ میں ایسی رچ بس جائے کہ اس کی کوئی حرکت اللہ کی یاد سے خالی نہ ہو، وہ کام کرے گا ''بسم اللّٰہ'' پڑھ کر کرے گا، ہر نعمت پر اس کا شُکر ادا کرے گا، ہر کوتاہی اور قصور پر اس کے آگے معافی مانگے گا، حاجت کے وقت اس کے حضور میں ہاتھ پسارے گا، ہر مشکل میں اس کو پکارے گا، ہر مصیبت میں ''إنّا للّٰہ'' کہے گا، کبریائی وعظمت کے موقع پر بے ساختہ اس کے منہ سے ''اللّٰہ أکبر'' نکلے گا، ہر معاملہ میں اس کے آگے ہاتھ پھیلائے گا، کوئی بُری بات کان میں پڑے گی وہ ''معاذ اللّٰہ'' اور ''نعوذ باللّٰہ'' کہے گا، ہر نامناسب بات پر ''لاحول ولا قوۃ إلّا باللّٰہ'' کے الفاظ اس کی زبان پر جاری ہوجائیں گے، اُٹھتے بیٹھتے ہر کام اور ہر بات پر ''الحمد للّٰہ''، ''سبحان اللّٰہ''، ''ماشاء اللّٰہ''، ''إن شآء اللّٰہ'' جیسے بابرکات کلمات اس کی زبان سے ادا ہوتے رہیں گے۔ یہ اللہ سے اس کی محبت وتعلق کا نہایت بیّن ثبوت ہوگا۔

''ذکر اللہ'' کرنے والوں کی شان یہ ہے کہ دنیا کے معالات اور تجارت میں لگے ہوئے ہیں، پھر بھی دل اُن کے کہیں اور ہی اَٹکے ہوتے ہیں، نہ ان سے فرائض کی ادائیگی میں غفلت ہوتی ہے اور نہ وہ ادائے حقوق میں سستی کرتے ہیں۔ ان کی زبان ''بارك اللّٰہ''، ''یرحمك اللّٰہ''، ''یغفر اللّٰہ''، ''رحمۃ اللّٰہ''، ''واللّٰہ، باللّٰہ، إلا اللّٰہ'' اور اردو میں ''اللہ کی رحمت ہو''، ''اللہ ہدایت دے''، ''اللہ برکت دے''، ''اللہ صحت دے''، ''اللہ رکھے''، ''اللہ عافیت دے''، ''اللہ خیریت سے پہنچائے''، ''اللہ توفیق دے''، ''اللہ خیر کرے''، ''اللہ بخشے''، ''اللہ رحم کرے''، ''اللہ معاف کرے''، ''اللہ کی پناہ'' وغیرہ جملوں سے تر رہتی ہے۔

صوفیاء کے اوراد واذکار

صوفیاء کا طریقۂ سلوک، اَوراد واَذکار اور اَشغال واَعمال کا دستور العمل جو اصلاحِ اعمال واحوال کا کامیاب تجرباتی طریقۂ کار ہے، اس نظام کا ایک حصّہ ہے، چنانچہ شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ آیۂ شریفہ: ''وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ'' (المزمل:۸) ''اور آپ اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرو۔'' کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

ترجمہ: ''یعنی آپ اپنے پروردگار کا نام ہمیشہ یاد کرتے رہیں، ہر وقت اور ہر کام میں اور ہر عبادت کے ساتھ خواہ اس کے اثناء میں ہو، اور خواہ اس کے اول وآخر میں، خواہ زبان سے ہو، خواہ لطیفۂ قلب سے اور خواہ روح سے اور خواہ سِری ہو، خواہ خفی اور خواہ اخفی، اور خواہ نفس سے ہو، خواہ دن میں ہو، خواہ رات میں، ذکرِ لسانی سراً ہو یا جہراً، اور چاہے پوشیدہ ہو، اور پروردگار کا نام خواہ اسمِ ذات ہو یا اسمِ اشارہ، ''ھو'' سے ہو یا اسماءِ حُسنٰی میں سے کسی ایک نام سے ہو، جو نام سالک کی ذات اور اس کے حال اور وقت کے زیادہ مناسب ہو، پھر اسمِ ذات یا کلمہ طیّبہ کے ضمن میں نفی واثبات کے ساتھ، خواہ ''سبحان اللّٰه''، ''الحمدللّٰه''، ''اللّٰه أكبر'' اور ''لاحول ولاقوّة إلا باللّٰه'' کے ساتھ اور دوسرے مسنون اذکار کے ساتھ ہو، اور خواہ کیفیتِ ذکر یک ضربی ہو خواہ دوضربی، یا اس سے بھی زیادہ، خواہ حبسِ نفس کے ساتھ ہو یا حبسِ دم کے بغیر، برزخ کے بغیر ہو یا برزخ کے ساتھ، خواہ سہ رکنی ہو یا ہفت رکنی، خواہ شرائطِ عشرہ کے ساتھ ہو (یعنی شد، مد، تحت، فوق، محاربہ، مراقبہ، محاسبہ، مواعظ، تعظیم اور حرمت) یا ان شرائط وغیرہ کے بغیر دوسری خصوصیات کے ساتھ ہو جو ماہرینِ اہلِ طریقت کی وضع واستنباط کی ہوئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے: ''اگر تمہیں خود علم نہیں ہے تو نصیحت کا علم رکھنے والوں سے پوچھ لو۔'' (الانبیاء:۷)

دس کلماتِ اذکار کا تذکرہ جن کا ہر شریعت میں رواج ومعمول رہا

شاہ عبدالعزیز مُحدّث دہلویؒ ایسے دس کلماتِ اذکار کے متعلق تفسیر ''فتح العزیز'' میں رقم طراز ہیں:

''درایں جا باید دانست کہ اذکارِ عشرہ کہ تسبیح وتحمید وتکبیر وتہلیل وتوحید وحوقل وحسبلہ وبسملہ واستعانت وتبارک است، ودر ہر شریعت صیغِ مختلفہ آنہا رائج ومعمول است۔''

یعنی ''یہاں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اذکارِ عشرہ : ۱- ''سبحان اللّٰه'' کہنا، ۲- ''الحمدللّٰه'' کہنا، ۳- ''اللّٰه أكبر'' کہنا، ۴- کلمہ ''لا إلٰه إلا اللّٰه'' پڑھنا، ۵-

’’وحدہٗ لاشریك لہٗ‘‘ کہنا، ۶-’’لاحول ولاقوّۃ إلا باللہ‘‘ کہنا، ۷-’’حسبنا اللہ‘‘ کہنا، ۸-’’بسم اللہ الرحمن الرحیم‘‘ کہنا، ۹-اللہ تعالیٰ سے استعانت مانگنا، ۱۰-برکت مانگنا، مذکورہ بالا دس کلمات ہر شریعت میں مختلف الفاظ اور صیغوں کے ساتھ رائج اور قابلِ عمل ہیں۔‘‘

دُعا مانگنے کا سادہ اور آسان طریقہ

دُعا مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد کی جائے، پھر رب العالمین کے حضور میں عرضِ مدّعا کیا جائے، اس انداز سے جو دُعا کی جائے گی وہ قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔(ابوبکر جصاص، احکام القرآن، ج:۱،ص:۴۲)

دعا نہایت عاجزی وانکساری سے کرنی اور خاموشی سے مانگنی چاہیے، اس طرح دکھاوے اور شہرت کا خطرہ نہیں رہتا۔ خاموشی سے دعا مانگنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ دعا میں خوف وطمع دونوں ہونی چاہئیں، قبولیت کی اُمید اور گناہوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے رد ہونے کا کھٹکا رہنا چاہیے۔ نا امیدی بھی کفر ہے، اور بے جا اعتماد اور گھمنڈ بھی اچھا نہیں۔

دعا اور تعوذ کی مثال

ادعیہ وتعوذاتِ ماثورہ ہتھیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہتھیار کی قدر و قیمت چلانے والے سے ہوتی ہے، اس کی دھار سے نہیں، اس میں کامیابی کے لیے حسبِ ذیل تین شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے:

❶-ہتھیار درست ہو۔

❷-چلانے والے کے ہاتھوں میں جان ہو، سوجھ بوجھ بھی اچھی ہو۔

❸-کسی قسم کی رکاوٹ بھی موجود نہ ہو۔ پھر نتیجہ صحیح نکلتا ہے۔ مذکورہ بالا تین شرطوں میں سے ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو نتیجہ صحیح نہیں نکلے گا، چنانچہ ضروری ہے کہ:

❶-دعا کے الفاظ صحیح یاد ہوں۔

❷-دعا مانگنے والے کے دل وزبان میں موافقت ہو، جو زبان سے ادا ہو دل بھی اس کا ہمنوا ہو۔

❸-کوئی اور چیز قبولیتِ دعا سے مانع موجود نہ ہو، پھر نتیجہ صحیح برآمد ہوتا ہے، ورنہ نہیں۔

تین طریقوں سے دعاؤں کا آغاز

دعاؤں کا آغاز تین طریقوں سے کیا جاتا ہے اور یہ تینوں طریقے مسنون دعاؤں میں پائے

جاتے ہیں، ان میں کون سا طریقہ سب سے بہتر ہے؟ اس کی طرف علّامہ ابن القیم الجوزیؒ نے اشارہ کیا ہے، چنانچہ وہ ’’التفسیر القیم‘‘ میں رقم طراز ہیں:

’’دعائیں تین طرح سے مانگی جاتی ہیں:

اول: یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے اسماء وصفات کا واسطہ دے کر دُعا مانگی جائے، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے:

’’وَلِلّٰهِ الْأَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا‘‘ (الاعراف:۱۸۰)

ترجمہ: ’’اور اسماءِ حسنیٰ (اچھے نام) اللہ ہی کے ہیں، اُس کو اُنہی ناموں سے پکارو۔‘‘

یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اسماءِ حسنیٰ میں سے کسی اسم کا ورد تکرار کی وجہ سے ذکر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، یا پھر دعا کی صورت اختیار کر جاتا ہے، اس لیے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا ہر نام دعا گو کی کسی ضرورت سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسرے: یہ کہ تم اپنی حاجت، درماندگی، ذلت و عاجزی کا اظہار کرو اور سائل بن کر مانگو، جیسے یوں کہو: ’’أَنَا الْعَبْدُ الْفَقِيْرُ الْمِسْكِيْنُ الْبَائِسُ الْمُسْتَجِيْرُ.‘‘ وغیرہ۔

تیسرے: یہ کہ تم اس کے آگے ہاتھ پسارو، اس سے التجا اور درخواست کرو، لیکن جو حاجت ہے، اُس کا ذکر نہ کرو۔

پہلی قسم دوسری قسم سے زیادہ بہتر و زیادہ کامل ہے، اور دوسری قسم تیسری سے زیادہ اچھی اور کامل تر ہے۔ جس دعا میں یہ تینوں باتیں جمع ہو جائیں، وہ ان میں سب سے زیادہ کامل و جامع طریقۂ دعا ہے۔‘‘

رسالت مآب ﷺ کی دعاؤں میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعاؤں میں بھی یہ تینوں خوبیاں یکجا موجود ہیں، چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ کی مشہور دعا ہے: ’’اللّٰهُمَّ إِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْماً كَثِيْراً .‘‘... ’’اے اللہ! بے شک میں نے اپنی جان پر بہت ہی ظلم ڈھایا ہے۔‘‘ یہ تو سائل کا حال ہے، پھر جس سے درخواست کی جارہی ہے، اُس کی صفت کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے: ’’وَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلاَّ أَنْتَ.‘‘.... ’اور بے شک تیرے سوا گناہوں کو معاف کرنے والا کوئی نہیں۔‘‘ پھر فرمایا: ’’فَاغْفِرْلِيْ مَغْفِرَةً مِّنْ عِنْدِكَ.‘‘... ’’سو آپ اپنی طرف سے مجھے بخش دیجئے۔‘‘ اس جملے میں اپنی حاجت کا ذکر ہے، اور دعا کا خاتمہ دو اسماءِ حسنیٰ ’’غفور‘‘ اور ’’رحیم‘‘ پر کیا گیا جو مطلوب کے مناسب اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں، چنانچہ خاتمۂ دعا میں کہا گیا ہے: ’’إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ.‘‘... ’’بلاشبہ آپ ہی بخشنے والے مہربان ہیں۔‘‘

لفظ ''اللّٰھُمَّ'' سے دعاؤں کا آغاز

اکثر و بیشتر دعاؤں کا آغاز ''اللّٰھُمَّ'' کے لفظ سے ہوتا ہے۔ مشہور تابعی و نامور محدّث ابورجاء عمران بن ملحان عطاردیؒ (متوفی ۱۰۵ھ) کا قول ہے کہ: ''اللّٰھُمَّ'' کے لفظ میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کے اسرار جمع ہیں۔ مشہور امامِ لغت نضر بن شمیل بصریؒ (متوفی: ۲۰۴ھ) فرماتے ہیں: ''اللّٰھُمَّ'' اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کا جامع ہے۔

دعا میں حضورِ قلب

حکیم الامت حضرت تھانویؒ ''مہمّات الدعاء'' میں رقمطراز ہیں:

> ''صرف زبانی دعا کہ آموختہ سا رٹا ہوا پڑھ دیا، نہ خشوع نہ خشیت، نہ دل میں اپنی عاجزی کا تصور، یہ خالی از معنی دعا کیا ہوئی؟''

دعا میں جب تک کہ پورے طور پر قلب کو حاضر نہ کرے گا اور عاجزی اور فروتنی کے آثار اس پر نمایاں نہ ہوں گے، ایسی دعا، دعا نہیں خیال کی جاسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو قلب کی حالت کو دیکھتے ہیں۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے کہ حصول مقصد کے لیے موقع و محل کے اعتبار سے صحیح تدبیر اختیار کرنا لازمی امر ہے۔ جنگِ بدر کے موقع پر حضورِ اکرم ﷺ نے جنگی تیاری بھی کی اور دُعا بھی مانگی، اس طرح ہر مسلمان کے لیے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ان دونوں باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس زمانے میں خواتین اور مرد سب ہی تعویذ گنڈوں کے چکر میں ہزاروں روپے لوگوں کو دیتے ہیں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پیر فقیر یہ کہہ کر چھوٹ جاتے ہیں کہ ہم نے توڑ کیا تھا، اس نے پھر جادو کردیا۔ اس طرح ساری عمر، اور وقت بھی ضائع کرتے اور رقم بھی برباد کرتے ہیں۔ یہ نتیجہ رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات اور موقع و محل کی دعا اور ذکر سے گریز کا ہے جو بنی نوع انسان کی گوناگوں پریشانیوں سے نجات کے لیے اس مجموعہ میں موجود ہیں۔

ان اذکار اور دعاؤں سے ان شاء اللہ پریشانیوں سے نجات بھی حاصل ہوگی اور اجر و ثواب بھی ملے گا اور انسان کا اللہ تعالیٰ سے بندگی کا رشتہ بھی بندھا رہے گا، بلکہ تعلق و رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہے گا اور ایمان پر خاتمہ نصیب ہوگا۔ مسلمان کی یہی سب سے بڑی آرزو اور کامیابی ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مجاہدہ

تزکیۂ نفس کا ذریعہ

مولانا محمد راشد شفیع
امام جامع مسجد اللہ والا، کراچی

قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھاویں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ (کی رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے۔'' (العنکبوت:۶۹)

جہاد کے اصلی معنی ہیں:

''دین میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنا۔''

اس میں وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو کفار وفجار کی طرف سے پیش آتی ہیں، کفار سے جنگ ومقاتلہ اس کا اعلیٰ فرد ہے۔ اور وہ رکاوٹیں بھی داخل ہیں جو اپنے نفس اور شیطان کی طرف سے پیش آتی ہیں۔

جہاد کی ان دونوں قسموں پر اس آیت میں یہ وعدہ ہے کہ ہم جہاد کرنے والوں کو اپنے راستوں کی ہدایت کر دیتے ہیں، یعنی جن مواقع میں خیر وشر یا حق و باطل یا نفع وضرر میں التباس ہوتا ہے، عقلمند انسان سوچتا ہے کہ کس راہ کو اختیار کروں؟ ایسے مواقع میں اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو صحیح، سیدھی، بے خطر راہ بتا دیتے ہیں، یعنی ان کے قلوب کو اسی طرف پھیر دیتے ہیں جس میں ان کے لیے خیر و برکت ہو۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۷۱۶)

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مجاہدۂ نفس کے بغیر سالک کوئی مرتبہ حاصل نہیں کرسکتا، لہٰذا نفس کی مخالفت عبادت کی تمام قسموں کی بنیاد اور مجاہدے کے تمام درجوں کا کمال ہے۔ بندہ اس مقام تک رسائی

کے بغیر راہِ حق کو نہیں پا سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے نفس کی مخالفت کا حکم دیا ہے۔

ایک بزرگ نے اس کی مثال اس طرح دی کہ ایک کاغذ کو موڑ دیا جائے، اب اگر اس کاغذ کو سیدھی جانب موڑتے رہیں گے تو کبھی وہ سیدھا نہیں ہوگا اور اگر اس کو مخالف سمت میں موڑیں گے تو وہ سیدھا ہو جائے گا۔ اسی طرح نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو مخالف سمت موڑیں گے تو یہ نفس سیدھا ہو جائے گا، یہی مجاہدہ ہے۔

''غنية الطالبين'' میں حضرت شیخ ابوعلی دقاق رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول روایت کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''جس شخص نے اپنے ظاہر کو مجاہدہ کے ذریعے آراستہ کیا، اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں اس کے باطن کو مشاہدہ کے ساتھ آراستہ فرما دے گا۔''

ایک غزوہ سے واپسی پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

''اب ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔'' انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جہادِ اکبر کیا ہے؟ فرمایا: ''وہ نفس سے مجاہدہ ہے۔'' (أخرجه البيهقي في الزهد)

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''(بڑا) مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔'' (أخرجه أحمد بن حنبل في المسند: ٦ / ٢٠)

سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''(اگلے زمانوں میں) سب سے پہلے تم جس چیز کا اِنکار کرو گے وہ جہاد بالنفس ہوگا۔''

(ابن رجب الحنبلي في جامع العلوم والحكم: ١٩٦)

امام سفیان ثوریؒ کہتے ہیں:

''بے شک تمہارا دشمن وہی نفس ہے جو تمہارے پہلوؤں کے درمیان ہے۔ تم اپنے دشمن کے ساتھ جنگ سے بھی بڑھ کر اپنی نفسانی خواہشات کے ساتھ جنگ کرو۔''

(ابن بطال في شرح صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب من جاهد نفسهٗ في طاعة الله)

ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ نفس کی پیروی کرنا بہت بڑی حماقت ہے اور دنیا و آخرت میں ذلت و رسوائی کا باعث ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنا کا محاسبہ کرے اور دیکھے کہ اس نے اپنی کل کی دائمی زندگی کے لیے آگے کیا بھیجا ہے؟

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

خواتین کا رجال سازی میں کردار

مولانا عصمت اللہ نظامانی
فاضلِ تخصص علومِ حدیث، جامعہ

ایک مشہور اور زبان زد مقولہ ہے کہ: ''ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہے۔'' دورِ حاضر میں چاہے اسے لطیفے اور مزاح کا رنگ دیا جاتا ہو یا کسی اور تناظر میں ذکر کیا جاتا ہو، مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک حد تک یہ مقولہ درست ہے، خصوصاً اُمتِ مسلمہ کے علماء اور اکابرینِ ملت کے حالات اور ان کی سوانحِ حیات کا مطالعہ کرنے سے مسلمان عفت مآب خواتین کے بارے میں یہ کہاوت پوری طرح صادق نظر آئے گی۔

بڑے بڑے فقہاء و محدثین اور دیگر مسلمان زعماء کی رجال سازی میں خواتین کا اہم کردار نظر آئے گا، عورت کہیں ماں کے روپ میں، کہیں بہن یا بیٹی کی صورت میں اور کہیں شریکِ حیات کی شکل میں مرد کی شخصیت سازی کرتی پائی جائے گی۔ ماضی کی جن قابلِ قدر ہستیوں پر مسلمان فخر کرتے ہیں، اور غیروں کے سامنے ان کے بلند پایہ کارنامے بیان کرتے ہیں، اگر ان کی تعلیم و تربیت، کردار سازی، حوصلہ افزائی اور شخصیت نکھارنے کے سلسلے میں عورت کی کاوش و کوشش شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید اُن میں سے کئی حضرات تاریخ کا ایک گمشدہ باب ہوجاتے، اور ان کے ''نام لیوا'' تو کجا! نام لینے والے بھی نہ ہوتے۔ ذیل میں ہم مختصر طور پر خواتین کا رجال سازی میں کردار بیان کریں گے۔

❶- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے شوہر کی وفات کے بعد اکیلے ہی اپنے بیٹے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی تربیت پر خصوصی دھیان دیا تھا، اور بڑی توجہ سے ان میں بہادری، شجاعت، تحمّل و بردباری اور دیگر اعلیٰ صفات پیدا کرنے لیے جد و جہد کی تھی، چنانچہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو ان پر سختی بھی کرنا پڑتی، اور کبھی تادیباً مارنے کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا چچا نوفل یہ دیکھ کر حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو ڈانٹتا کہ ''إنك لتضربينه ضرب مبغضة'' یعنی تم بچے کو بالکل دشمنوں کی طرح مار رہی

ہو، لیکن حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا ان کو جواب دیتی کہ یہ سب اس کی تربیت کی وجہ سے ہے، اور اشعار کہتیں، ایک مصرعہ حسبِ ذیل ہے:

من قال: إنّي أبغضهُ فقد كذب   وإنّما أضربهُ لكي يلب (۱)

ترجمہ: ''جس نے یہ کہا کہ میں اس سے بغض رکھتی ہوں، اس نے جھوٹ کہا، میں تو اس کو صرف اس وجہ سے مارتی ہوں کہ وہ عقلمند ہو۔''

پھر آنے والے لوگوں نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہترین تربیت اور شخصیت سازی کا نتیجہ دیکھا کہ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نڈر مجاہد اور اسلام کے ایک سپاہی بن کے پوری زندگی دینِ حق کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔

❷ - حضرت ربیعۃ الرائے رحمۃ اللہ علیہ ایک بلند پایہ فقیہ اور مشہور محدث ہیں، وہ ابھی شکمِ مادر میں تھے کہ ان کے والد کو جہاد کی غرض سے مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہوکر خراسان جانا پڑا۔ روانگی سے قبل انہوں نے اپنی بیوی کو تیس ہزار دینار دیئے تھے، تاکہ بوقتِ ضرورت کام آئیں، لیکن پھر ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ستائیس سال بعد اپنے گھر واپس لوٹے۔ اس دوران حضرت ربیعۃ الرائےؒ کی والدہ نے تنہا ہی ان کی عمدہ تربیت کی، انہیں تعلیم دلائی، جس کے نتیجہ میں وہ اپنے زمانے کے بڑے محدث اور فقیہ بن گئے۔

حضرت ربیعہؒ اور ان کے والد کی پہلی ملاقات کا قصہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ جب ستائیس سال بعد فروخ گھر لوٹے تو اپنے ہاتھ میں موجود نیزے کے ذریعے دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت ربیعہؒ باہر نکل آئے، باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا نہیں تھا، اس لیے حضرت ربیعہؒ نے جب انہیں اس حال میں دیکھا تو اندیشہ ہوا کہ کہیں حملہ آور نہ ہو، اس لیے کہا: ''يا عدو الله! أتهجم على منزلي''، یعنی اے اللہ کے دشمن! میرے گھر پر حملہ کرنا چاہتے ہو؟ فروخ کہنے لگا: ''يا عدو الله! أنت رجل دخلت علىٰ حرمتي''.... ''اے اللہ کے دشمن! تم میری عزت وحرمت پر داخل ہوئے ہو۔''

ان دونوں کے درمیاں جھگڑا ہونے لگا، پڑوسی جمع ہوگئے، امام مالکؒ اور دیگر اہلِ علم حضرت ربیعۃ الرائےؒ کی مدد کرنے لگے۔ حضرت ربیعہؒ کا کہنا تھا کہ اس کو سلطان کے پاس لے کر جاؤں گا۔ فروخ کہنے لگے کہ: یہ میری بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ جب امام مالکؒ نے اس کو سمجھایا کہ اس گھر کے علاوہ کہیں اور چلے جاؤ، تب انہوں نے کہا کہ یہ میرا گھر ہے، میں فروخ ہوں۔ یہ سن کر ان کی بیوی گھر سے نکل آئی اور کہنے لگی کہ: یہ تمہارا بیٹا ہے، جب تم گئے تھے تو میں حاملہ تھی، چنانچہ دونوں باپ بیٹے گلے

مل کر رونے لگے۔

کچھ دیر کے بعد حضرت ربیعہؒ مسجد چلے گئے، تو فروخ نے اپنی بیوی سے بوقتِ رخصت دیئے گئے تیس ہزرا دینار کے بارے میں پوچھا، اس نے جواب دیا کہ میں نے وہ ایک جگہ لگا دیئے ہیں، عنقریب آپ کو دوں گی۔ پھر فروخ سے کہا کہ مسجد جا کر نماز پڑھ لیں، چنانچہ انہوں نے نماز پڑھی اور پھر وہاں ایک حلقے کے قریب ٹھہر گئے، جہاں امام مالکؒ سمیت کئی اہلِ علم موجود تھے، اور ان کے درمیان ایک نوجوان بیٹھا تھا، چونکہ اس کا چہرہ نیچے کی طرف تھا، اور سر پر ٹوپی اور عمامہ تھا، اس لیے فروخ اس کو پہچان نہ سکے اور اپنے نزدیک بیٹھے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ ابوعبدالرحمٰن فروخ کا بیٹا ربیعہ ہے۔ فروخ بہت خوش ہوئے اور گھر آکر بیوی سے کہنے لگے کہ میں نے تمہارے بیٹے کو ایسی عمدہ حالت میں دیکھا ہے کہ دوسرے کسی فقیہ یا عالم کو نہیں دیکھا، اس پر ان کی بیوی کہنے لگی:

’’أیما أحب إلیك ثلاثون ألفَ دینار، أو هٰذا الذي هو فیه من الجاه؟‘‘

ترجمہ: ’’آپ کو کیا زیادہ پسند ہے؟ تیس ہزار دینار یا بیٹے کی یہ عزت جو اس کو حاصل ہے؟‘‘

’’فروخ نے جواب دیا کہ اللہ کی قسم! یہ حالت مجھے زیادہ پسند ہے، تو بیوی نے بتایا کہ وہ تمام دینار بیٹے کی تعلیم وتربیت پر خرچ کر دیئے تھے۔‘‘(۲)

❸-مشہور ومعروف محدث، امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کون ناواقف ہوگا، دورانِ طالب علمی ان کے مالی حالات کمزور تھے، اس لیے انہیں کسبِ معاش کی فکر ہوئی، لیکن ان کی ماں نے انہیں فکرِ معاش سے آزاد کر کے پڑھائی اور طلبِ علم کے لیے فارغ کر دیا، چنانچہ وہ سوت کات کر اسے فروخت کرتیں، اور اپنے بیٹے سفیان ثوری کی پرورش وکفالت کرتی تھیں، جیسا کہ امام وکیعؒ فرماتے ہیں:

’’قالت أم سفیان الثوري لسفیان: یا بني! اطلب العلم وأنا أكفیك من مغزلي.‘‘(۳)

ترجمہ: ’’حضرت سفیان ثوریؒ کی والدہ نے اپنے بیٹے سے کہا: اے میرے بیٹے! علم طلب کرو، میں تمہاری اپنے تکلہ (سوت کاتنے کا آلہ) کے ذریعے کفالت کروں گی۔‘‘

بلکہ وہ وقتاً فوقتاً حضرت سفیان ثوریؒ کو تحصیلِ علم سے متعلق نصائح بھی کرتی رہتی تھیں، چنانچہ ایک مرتبہ نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

’’یا بني! إذا كتبت عشرة أحرف، فانظر هل ترى نفسك زیادة في مشیك

وحلمك ووقارك، فإن لم يزدك فاعلم أنه لايضرك ولا ينفعك.‘‘(۴)

ترجمہ:’’اے میرے بیٹے! جب تم دس حروف سیکھ لو تو دیکھو کہ کیا تمہاری چال ڈھال، حلم وبردباری اور وقار میں اضافہ ہوا ہے؟ اگر کچھ زیادتی نہ ہوئی ہو تو جان لو کہ یہ علم نہ تمہیں نقصان پہنچائے گا اور نہ ہی نفع دے گا۔‘‘

ماں کی ایسی عمدہ پرورش اور تربیت کی وجہ سے حضرت سفیان ثوریؒ امیر المؤمنین فی الحدیث اور اپنے عہد کے بے مثال محدث بنے۔

❹- حضرت امام مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ ائمہ اربعہ میں سے ایک ہیں، ان کو علمِ حدیث اور فقہ دونوں میں بلند مقام حاصل تھا، جب انہوں نے اپنی والدہ کے پاس آکر طلبِ علم کے لیے جانے کی اجازت چاہی تو ان کی والدہ نے انہیں عمدہ کپڑے پہنائے، سر پر ٹوپی پہنا کر اس پر عمامہ باندھا، اور پوری طرح تیار کر کے طلبِ علم کے لیے بھیجا۔(۵)

اور یہ تیاری ایک دن کے لیے نہیں تھی، بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ انہیں باقاعدگی سے تیار کرتی تھیں۔ اسی طرح طلبِ علم کے ساتھ ادب واخلاق کی تعلیم حاصل کرنے کی بھی انہیں ترغیب دیتی تھیں، چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں:

’’كانت أمي تعممني وتقول لي: اذهب إلٰى ربيعة، فتعلم من أدبه قبل علمه.‘‘(۶)

ترجمہ:’’میری والدہ مجھ کو عمامہ باندھتی اور مجھ سے کہتی تھی کہ ربیعہ کے پاس جا کر اس کے علم سے پہلے اس کا ادب سیکھو۔‘‘

❺- علامہ ابن حجرؒ کی ہستی سے کون ناآشنا ہوگا۔ ان کی تالیفات، خصوصاً حدیث اور علومِ حدیث میں خدمات سے آج تک اہلِ علم مستفید ہو رہے ہیں۔ ان کی تربیت میں بھی ان کی بہن ’’ست الرکب‘‘ کا بڑا دخل تھا۔ حافظ ابن حجرؒ کے بچپن میں ہی ان کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا، چنانچہ ان کی بہن نے پہلے خود تعلیم حاصل کی، اور مختلف علوم میں مہارت حاصل کی، اور پھر اپنے چھوٹے بھائی کی شخصیت سازی کی طرف متوجہ ہوئیں، حالانکہ خود بھی کم عمر تھیں، جیسا کہ علامہ ابن حجرؒ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

’’وكانت بي برّة، رفيقة، محسنة، جزاها الله تعالي عني خيرًا، فلقد انتفعت بها وبآدابها مع صغر سنها.‘‘(۷)

ترجمہ:’’وہ میرے ساتھ نیکی واحسان کرنے والی ساتھی تھیں، (اللہ تعالیٰ میری طرف سے

اس کو بہترین بدلہ عطا فرمائے) اس کی کم عمری کے باوجود میں نے اس سے اور اس کے آداب و اخلاق سے بہت استفادہ کیا۔''

اسی طرح علامہ ابنِ حجرؒ ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، اور اس کو اپنی ماں کا درجہ دیتے تھے، جبکہ ان دونوں کی عمروں میں تقریباً تین سال کا ہی فرق تھا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''وكانت قارئة كاتبة أعجوبة في الذكاء، وهي أمي بعد أمي.''(۸)

ترجمہ: ''وہ قاریہ، کاتبہ اور ذہانت میں عجوبۂ روزگار تھی، اور میری حقیقی ماں کے بعد میری ماں تھی۔''

خلاصہ یہ ہے کہ تاریخ گواہ ہے کہ مشاہیرِ ملت اور اُمتِ مسلمہ کے اکابرین کے بلند مقام و مرتبے اور ان کی کامیابی و کامرانی کے پیچھے عفت مآب خواتین کا ہاتھ نظر آئے گا، پہلے خواتین اسلامی تعلیمات سے واقف اور اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوتی تھیں، ان کو معلوم تھا کہ وہ ایک فرد کی نہیں، بلکہ ایک معاشرے کی تربیت اور شخصیت سازی کر رہی ہیں، اور زمانے نے دیکھا کہ ان اکابرین میں سے ایک ایک فرد امت کا رہنما و پیشوا بنا، لہٰذا خواتین کے رجال سازی میں کردار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ: ''ہر کامیاب مرد کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہے۔''

حواشی وحوالہ جات

۱-الإصابة في تمييز الصحابةؓ لابن حجر، (۲/ ٤٥٨)، رقم الترجمة: ۲۷۹٦، الناشر: دار الكتب العلمية- بيروت، ط:١٤١٥ھ

۲- تاریخ بغداد للخطيب، (۸/ ٤٢٢)، الناشر: دار الكتب العلمية- بيروت، ط:١٤١٧ھ

۳-تاريخ جرجان للجرجاني، (ص:٤٩٢)، الناشر: عالم الكتب- بيروت، ط:١٤٠٧ھ- ١٩٨٧ء

٤-صفوة الصفوة لابن الجوزي، (۳/ ۱۸۹)، الناشر: دار المعرفة، بيروت

٥-الديباج المذهب في معرفة أعيان المذهب لليعمري، (۱/ ۹۸)، الناشر: دار التراث للطبع والنشر، القاهرة

٦-ترتيب المدارك وتقريب المسالك للقاضي عياض، (۱/ ۱۳۰)، الناشر: مطبعة القضالة- المحمدية، المغرب

۷-المجمع المؤسس للمعجم المفهرس لابن حجر، (۳/ ۱۲۲)، الناشر: دار المعرفة- بيروت

۸-إنباء الغمر بأبناء العمر لابن حجر، (۳/ ۳۰۲)، الناشر: دار الكتب العلمية- بيروت، ط: ١٤٠٦ھ- ١٩٨٦ء

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی

ہمارے موجودہ مسائل کا حقیقی حل

مولانا سفیان علی فاروقی
لاہور

نبی کریم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے بعد چند ہی سالوں میں دنیا کا معاشرتی نقشہ بدل گیا۔ تاریخ آج بھی ورطۂ حیرت میں ہے کہ اتنا بڑا معاشرتی انقلاب چند سالوں میں کیسے ممکن ہوا؟ وہ معاشرتی انقلاب اتنا جامع ومکمل تھا، اتنا کامل واکمل تھا، اتنا بہترین اور لازوال تھا کہ پندرہ سو سال بعد بھی اگر کائناتِ انسانی میں کسی آئیڈیل معاشرے کی مثال دی جاتی ہے تو کیا اپنے، کیا پرائے، سب کے سب نبوی معاشرے کی مثال دیتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات

نبی کریم ﷺ نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کی معاشرت کو دنیا کے لیے نمونہ بنانا تھا، سو اس لیے ان کی معاشرت کو بہتر سے بہترین بنایا، یہ نبی کریم ﷺ کی محنت ہی تھی کہ جو لوگ معاشرتی بدحالی کا شکار تھے، وہی لوگ معاشرتی زندگی کے لیے کسوٹی اور پیمانہ بن گئے۔ وہی معاشرہ نبوی اصلاحات کی بدولت دنیا کا بہترین اور آئیڈیل معاشرہ کہلایا۔

نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے دلوں سے ایک دوسرے کی نفرت کو نکال کر ایک دوسرے کے لیے محبت بھر دی، بلکہ اس سے بھی آگے ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کر دیا کہ اپنی ذات اور ضروریات پر دوسرے مسلمان کی ضروریات مقدم لگنے لگیں، اپنی جان سے زیادہ دوسرے مسلمان کی جان عزیز ہونے لگی اور خون کے پیاسے محبت کے خوگر بن گئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کی معاشرت کو ایسا سنوارا کہ وہ چرواہے جنہیں تہذیب وتمدن کا سرے سے پتا ہی نہیں تھا، دنیا نے انہی کے تمدن سے اپنے معاشروں کے خطوط استوار کیے، انہی چراغوں سے روشنی لے کر اپنے عہدوں کو روشن کیا، انہی کے قدموں سے علم کے وہ سُوتے

پھوٹے کہ آج تک معاشرت اور عمرانیات کے علوم ان کے در کے ریزہ چیں ہیں۔

نبوی معاشرے کے بنیادی اجزاء میں سے ایک امر بالمعروف و نہی عن المنکر تھا، نیکی کی تلقین اور برائی سے روک تھام، نبوی معاشرے کا ہر فرد اس عمل سے چوبیس گھنٹوں میں کبھی بھی غافل نہیں ہوتا تھا، اسی وجہ سے اس معاشرے میں کرائم لیول زیرو تھا، نہ صرف کرائم لیول زیرو تھا، بلکہ اسی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی برکت سے نبوی معاشرہ جسمانی بیماریوں سے بھی محفوظ تھا۔ اسی طرح نبوی معاشرہ کو نبی کریم ﷺ نے ''تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ'' پر کھڑا کیا تھا کہ نیک کاموں میں ایک دوسرے کا بھرپور ساتھ دینا اور برے کاموں میں بالکل بھی ساتھ نہیں دینا، اس سے معاشرہ اخلاقی برائیوں سے بالکل پاک ہوگیا تھا۔ اسی طرح دین پر عمل کرنے کا جذبہ تمام کاموں اور تمام جذبوں پر غالب تھا، دینی تقاضا آنے کے بعد اُن کے ذاتی تقاضے دور کہیں پیچھے رہ جاتے تھے، اسی طرح نبوی معاشرے کی ایک خاصیت یہ تھی کہ ان میں ایمانداری، خوفِ خدا، خشیتِ الٰہی، عفو و درگزر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جس سے ان کی معاشرتی خوبصورتی کو چار چاند لگے اور وہ ایک مکمل متمدن معاشرہ کہلوایا۔

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی

نبوی معاشرے کی جتنی بھی خوبصورتیاں ہم اوپر پڑھ کر آئے ہیں، ان سب کی نبی کریم ﷺ نے صرف تبلیغ نہیں کی، بلکہ خود عمل کر کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو سکھلایا، نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے عملی نمونہ تھی اور نبی کریم ﷺ احکاماتِ الٰہی پر عمل پیرا ہونے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہیں زیادہ آگے اور مستعد تھے۔ نبی کریم ﷺ کی معاشرتی زندگی پر کوئی صاحبِ فکر و دانش انگلی نہیں اُٹھا سکتا، اتنی جامع و مکمل معاشرتی زندگی دنیا میں آپ ﷺ کے علاوہ کسی کو عطا ہی نہیں کی گئی، حسنِ معاشرت کے تمام چشمے نبی کریم ﷺ کے قدموں سے پھوٹے۔ دنیاوی سطوت و اُخروی نجات کی تمام جہتیں آپ ﷺ کے نقشِ پا میں پنہاں ہیں۔ آج کی جاں بلب انسانیت کو بھی نبوی تعلیمات اور نبوی معاشرت کی ضرورت ہے، ہمارا معاشرہ انسانیت کے لیول سے نیچے گر چکا ہے، تعلیم میں ہم دنیا سے بہت پیچھے ہیں، صحت میں بھی بہت پیچھے ہیں، نظامِ عدل و انصاف میں پہلے سو ممالک میں ہمارا نام نہیں، گڈ گورننس نام کی چیز موجود نہیں، طاقت ور اور کمزور کے لیے قانون کی الگ الگ تشریحات کی جاتی ہیں۔

غرض معاشرتی بدحالی اور اخلاقی زبوں حالی کی ریڈ لائن عبور کر چکے ہیں، ایسے میں بہت زیادہ ضروری ہے کہ ہم نبوی معاشرت کو آئیڈیل بنائیں اور انہی خطوط پر اپنے معاشرے کی تشکیل کریں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

عصرِ حاضر میں قرآن کریم سے بے توجہی

مولوی محمد طیب حنیف
متعلم تخصصِ علومِ حدیث، جامعہ

حق تعالیٰ شانہٗ کے اَن گنت انعامات واحسانات میں سے دو انعام تاریخِ اسلامی کے لیے یادگار وبیش قیمت ہیں، جن کی بدولت گم گشتہ راہ انسان کو ہدایت وکامرانی کے زینہ سے متعارف کرایا گیا، جس سے قعرِ مذلت میں بھٹکی انسانیت نے ترقی کی منازل کو طے کیا۔ ان میں ایک سب سے عظیم نعمت فخرِ دوعالم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ اطہر ہے، جن کی آمد سے چہار دانگِ عالم میں توحید کا غلغلہ اُٹھا، جن کی بعثت نے اطرافِ عالم کو آفتابِ ہدایت کی کرنوں سے منور کیا، یوں انسانیت کی اندوہناک تاریخ نے گمراہیت کی تاریکیوں سے بامِ عروج تک کے سفر کا آغاز کیا۔

دوسری گراں قدر نعمت اُمتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات کے لیے کلامِ پاک کا نزول ہے، جس نے روحانی وجسمانی امراض وآلام میں گرفتار انسانیت کو بطورِ نسخۂ کیمیا علاج فراہم کیا، نیز مردہ دل اقوام کو ابدی زندگی سے روشناس کرایا، عقل وخرد کے حامل خود ساختہ رسوم وقیود میں جکڑے افراد کو کرامتِ انسانی کا بھولا ہوا درس یاد دلا کر بلند نگاہی ووسعتِ ظرفی سے بہرہ یاب کیا:

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

’’تم نے اپنی قدر وقیمت سے دونوں عالم کو مطلع کیا ہے، اپنی قیمت بڑھاؤ، یہ اس حد تک بھی سستا سودا ہے۔‘‘

حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس کو خوبصورت پیرائے میں ڈھالتے ہوئے فرمایا:

’’درحقیقت حضور ﷺ کی ذات گرامی کو دو بعثتوں سے سرفراز کیا گیا:

①- بعثتِ جسمانی: اس کو حیاتِ ظاہری سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، جس کا آغاز ماہِ ربیع الاول کے مہینہ سے ہوا، جس وقت آپ کی ذاتِ گرامی کو عدم سے وجود بخشا گیا، جس نے افرادِ انسانی کو حقیقی انسانیت کا سبق دیا۔

②- بعثتِ روحانی: اس کو حیاتِ ثانیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کی ابتدا نزولِ قرآن سے ہوئی، جس سے آپ کے شرف وکرامت میں مزید اضافہ ہوا۔

ان میں سے پہلی بعثت جمال ہی جمال تھی، جبکہ دوسری بعثت جمال وکمال کا بیش بہا خزینہ تھی، جس کا مشاہدہ آج تک کیا جارہا ہے۔‘‘(۱)

بعثتِ نبوی ﷺ کے مقاصد

قرآن مجید میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے ساتھ متعدد مقامات پر آپ کی بعثت ورسالت کے مقاصدِ عظمیٰ کو اُجاگر کیا گیا ہے، جس سے وحی اور موحیٰ الیہ (رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی) کا شرف وتکریم نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا:

’’هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔‘‘(۲)

ترجمہ: ’’(اللہ مالک وبرتر ذات) وہی ہے جس نے اُمی لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول کو بھیجا جو اُن کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگر چہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔‘‘

تعلیم وتعلُّمِ قرآن کی فضیلت

قرآن مجید باری کا کلام، رسول اکرم ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ، کتابِ ہدایت، دستورِ حیات وتمام انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے، جس کے الفاظ کے ساتھ معانی کے تحفظ کا ذمہ قدرتِ خداوندی نے لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیم وتعلُّم کو افضل ترین اعمال میں شمار کرکے اس سے وابستہ افراد کو خیریت کا مژدہ سنایا ہے۔ اس عمل کے دیگر اعمال سے افضل ہونے کے سبب کو شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ نے یوں اُجاگر کیا ہے:

’’کلام پاک چوں کہ دین اسلام کی اصل وبنیاد ہے، اس کی بقاء وثباتی پر شریعت دین کا مدار ہے، اس پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن مجید کا افضل ترین ہونا ظاہر وباہر ہے۔‘‘(۳)

یہ بات تو مسلم ہے کہ جس چیز کی جس قدر اہمیت وعظمت ہوتی ہے، اسی لحاظ سے اس کے آداب

وحقوق کی رعایت و پاسداری کی طرف توجہ مبذول کرائی جاتی ہے، چونکہ اس عظیم نعمت سے غفلت و بے توجہی بسااوقات ابدی محرومی کا سبب بنتی ہے، چنانچہ قرآن مجید کو خوش الحانی سے ترتیل وتجوید سے پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے معانی ومفاہیم میں تفکُّر وخوض اور اس کو عملی زندگی میں زندہ کرنا یہ بھی اس کے حقوق میں داخل وشامل ہے، جس کی رعایت ہر مسلمان پر ضروری ہے۔

ہجر القرآن (قرآن کریم سے بے توجہی) کا مفہوم

قرآن مجید میں صراحتاً آتا ہے کہ روزِ قیامت رسولِ خدا ﷺ اپنی قوم سے متعلق شکویٰ وشکایت کریں گے کہ انہوں نے قرآن مجید کو مہجور بنادیا، چنانچہ فرمایا: ’’وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَارَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْرًا۔‘‘(۴)

لفظ ’’مَهْجُوْر‘‘ یہ کلمہ ’’هجر‘‘ سے ماخوذ ہے، جس کے دو معانی مفسرین نے ذکر کیے ہیں:

①- کسی چیز کو ترک کردینا/ لاپرواہی کے ساتھ پسِ پشت ڈال دینا۔ اس کا معنی تو بالکل واضح ہے کہ روزِ قیامت رسولِ خدا ﷺ قرآن مجید سے عدمِ التفات وبے توجہی کی شکایت کریں گے، جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے کہ قرآن مجید اپنے حقوق کی کوتاہی پر حق تعالیٰ شانہ کے دربار میں مخاصمت کرے گا، فرمایا:

’’من تعلم القرآن وعلق مصحفهٗ لم يتعاهده ولم ينظر فيه جاء يوم القيامة متعلقًا به يقول: يا رب! عبدك هٰذا اتخذني مهجورا اقض بيني و بينهٗ.‘‘(۵)

ترجمہ: ’’جس نے قرآن مجید کو سیکھا، اور پھر اس کو طاقچہ میں رکھ کر اس کے حقوق کی رعایت سے غفلت برتی، اس میں دیکھ کر پڑھنے کا بالکل اہتمام نہیں کیا، ایسی صورت میں یہی قرآن روزِ قیامت اس کے ساتھ چمٹے ہوئے آئے گا اور حق تعالیٰ شانہٗ کی بارگاہ میں درخواست گزار ہوگا کہ اے میرے رب! آپ کے اس بندے نے مجھے بالکل سِرے سے پس پشت ڈال دیا، میرے اور اس کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمادیجئے۔‘‘

②- ہذیان وبدگوئی، یعنی روزِ قیامت رسولِ خدا ﷺ اس بات کی شکایت کریں گے کہ یہ اقرارِ حق سے روگردانی کرنے والے قرآن مجید کو لغو وعبث کلام تصور کرتے ہوئے اس کو تختۂ مشق بناتے اور اس کو استہزاء کا نشانہ بناتے تھے، اور اس کے سامنے آوازیں بلند کرکے اس کی تحقیر وتوہین کا ارتکاب کرتے تھے۔(۶)

ہجر القرآن کی عملی مروجہ صورتیں

حافظ ابن القیم حنبلیؒ نے اپنی کتاب ’’الفوائد‘‘ میں ہجر القرآن کی پانچ عملی صورتوں کو ذکر کیا ہے، جو

درج ذیل ہیں:

❶ - تلاوتِ قرآن اور سماعت میں بے توجہی کا اظہار

عام طور پر یہ مشاہدہ ہے کہ قرآن مجید کو مخصوص حالات مثلاً غم و کرب، مخصوص زمان مثلاً کسی عزیز کی رحلت و وصال پر تلاوت کیا جاتا ہے، باقی ایام میں اس کو نہایت غفلت کے ساتھ الماری کی نذر کر دیا جاتا ہے، یہ نہایت برا عمل ہے، اسی طرح قرآن مجید پڑھتے ہوئے خاموشی سے کان لگانے کے بجائے اس پر آوازیں بلند کرنا، یا محض عدمِ التفات یہ سب ''ھجر القرآن'' کے وسیع مفہوم کا حصہ ہیں، جن سے احتراز ضروری ہے۔

❷ - آیات و مضامینِ قرآنی کے فہم و تفکر سے غفلت کا اظہار

قرآن مجید حق تعالیٰ شانہ کا کلام ہے، جن سے ہر صاحبِ ایمان شخص کو محبت ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ محبوب کے خط تک رسائی کی صورت میں عاشق اس وقت تک بے چین و بے سکونی کی زندگی بسر کرتا ہے جب تک کہ اس کے مندرجات پر اطلاع نہ ہوجائے، اور اس کے مضمون کی فہم دانی کے لیے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھاتا ہے، تو کیا ملک الملوک ذات کے کلام کو اس قدر بھی اہمیت و رتبہ حاصل نہیں؟

❸ - احکاماتِ قرآنی پر عمل پیرائی سے استغنا کا اظہار

قرآن مجید کو دستورِ حیات، مشعلِ راہ اور کتابِ ہدایت تسلیم کرنے کے باوجود اس کے حلال وحرام، اوامر ونواہی سے متعلق کوتاہی و غفلت کا اظہار یہ ایسا شنیع عمل ہے، جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ معاشرے میں سکونت پذیر خلقتِ خدا کی ایک بڑی تعداد اس مرض میں مبتلا ہے، جو مغربی تہذیب و تمدن پر اس قدر فریفتہ ہیں کہ ان کے طرزِ زندگی کے اپنانے کو باعثِ فخر و مسرت تصور کرتے ہوئے اس کو کامیابی سمجھا جاتا ہے، اور اس تاریک راہ کو ترقی کے دلفریب عنوان و لیبل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے:

میں قرآن پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
میرے ایمان کی ضد ہے مرا طرزِ مسلمانی

❹ - نجی زندگی و گھریلوں معاملات میں رفعِ تنازع کے لیے قرآنی ہدایات کو ناقص تصور کرنا

قرآن مجید ہمارے واسطے محض قصہ گوئی کی کتاب نہیں، بلکہ ایک جامع دستورِ حیات و قانونِ زندگی ہے، جس کے ذریعہ نجی و داخلی تنازعات کو بحسن وخوبی رفع کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو حکم و فیصل تسلیم کرنا اور اس کے مطابق زندگی کو ڈھالنا اس کے حقوق میں داخل و شامل ہے۔

❺ - امراضِ جسمانی و روحانی کے لیے نہایت مفید و باعثِ شفاء

انسانی جسم جو غم و تکالیف کی آماج گاہ ہے، اس میں روحانی و جسمانی امراض و تکالیف سے نجات کے لیے بعض آیات کا ورد بطور علاج و شفاء نہایت مجرب ہے، جب اس کلام پاک کے نزول کی تاثیر سے پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے تو روحِ انسانی سے حسد و عداوت، کینہ و بغض جیسی بیماریوں کو مکمل صاف کر دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ’’قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ‘‘ یعنی یہ قرآن مجید اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و شفایابی کا ذریعہ ہے۔ (۷)

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قرآن مجید کے ساتھ صحیح تعلق و وابستگی قائم کرنے اور اس کے حقوق کی پاسداری کی توفیق عطا فرمائے، اور روزِ قیامت اس کو ہمارے خلاف حجت بننے سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

حوالہ جات

۱: رمضان اور قرآن، مفتی ولی حسن ٹونکی صاحبؒ، صفحہ نمبر: ۳۵

۲: سورۃ الجمعۃ: ۲ ۔۔۔ ۳: فضائل قرآن، ص: ۱۰

۴: سورۃ الفرقان: ۳۰

۵: اس حدیث کی سند پر ابو ہدبہ راوی کی بنا پر کلام کیا گیا، اگرچہ معنیً بالکل درست مفہوم رکھتی ہے، ملاحظہ ہو: روح المعانی، آلوسی، ج: ۱۰ ص: ۱۵، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

۶: تفسیر البیضاوی، ج: ۴، ص: ۱۲۳، دار احیاء التراث العربی

۷: الفوائد لابن القیم، ص: ۸۲، دار الکتب العلمیۃ، بیروت

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

علمائے کرام اور سائنسدانوں کی ذمہ داریاں اور کام کا دائرہ کار

جناب ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی
لیکچرر کمپیوٹر سائنس ڈیپارٹمنٹ
کارک انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی
(سی آئی ٹی) آئرلینڈ

تحقیق کی آڑ میں شریعت کی مَن مانی تشریح

اُمتِ مسلمہ کی تاریخ کو اگر دیکھا جائے تو بہت سے فکری اور نظریاتی فرقے بنے ہیں، جن سے اُمت میں افتراق وانتشار پیدا ہوا ہے۔ اگر ان فرقوں کے بننے کے عوامل پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان فرقوں کے بننے کی بنیادی وجہ قرآن وحدیث کی مَن مانی تشریح ہے۔ قرآنِ پاک کے معنی کے لیے جو شرائط وآداب ہیں اُن سے متعلق شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس کے لیے پندرہ علومِ دینیہ میں مہارت اور دسترس حاصل کرنا ضروری ہے اور ان میں سب سے اہم علمِ وہبی ہے جو کہ حق سبحانہ تقدس کا عطیۂ خاص ہے، جو کہ وہ اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتے ہیں، یعنی تھوڑی عربی جان لینے یا اردو تراجم دیکھ کر اگر کوئی اپنی رائے داخل کرے گا تو یہ سراسر گمراہی ہوگی۔

اگر ماضی قریب کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان فتنوں کو پیدا کرنے والوں میں بعضے پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور ایسے نام نہاد عصری علوم وجامعات کے محققین شامل تھے جنہوں نے اسلاف کی رائے سے ہٹ کر تحقیق کی آڑ میں شریعت کی مَن چاہی تشریح عوام کے سامنے پیش کی اور عوام کی ایک بڑی تعداد اُن کی وجہ سے گمراہ ہوگئی اور یہ گمراہی پھیلانے کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ تمام پروفیسر، ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان، اور محققین حضرات ہی گمراہ ہوگئے ہیں، لہٰذا یہ قطعاً مناسب نہیں کہ ہم عمومی طور پر ان تمام حضرات پر ہی گمراہی کا لیبل چسپاں کردیں اور نہ ہی ایسا

کرنا چاہیے۔ ماضی بَعید میں مسلمان سائنسدانوں میں ابوریحان محمد بن احمد البیرونی، فخر الدین رازی، ابونصر محمد بن محمد فارابی، ابن سینا، محمد بن موسیٰ خوارزمی، امام غزالی، اور ابن خلدون جیسے قابلِ ذکر نام ہمیں نظر آتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر سائنسدان طب، فلکیات، طبیعات، کیمیا، فلسفہ، علم الکائنات (کونیات)، ما بعد الطبیعات، منطق، ریاضی اور جغرافیہ وغیرہ سائنسی علوم کے ماہر تھے اور ان میں سے کچھ کی دینی حیثیت بھی مُسلَّم تھی، جن میں امام غزالیؒ کا نام قابلِ ذکر ہے، جبکہ ماضی قریب میں ہمیں بے تحاشا قابلِ ذکر مسلمان سائنسدان، ڈاکٹر، انجینئر، اور محققین عالمی اُفق پر نظر آجائیں گے جنہوں نے اپنے متعلقہ شعبے اور سائنس کی دنیا میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

نیز اُمتِ مسلمہ میں بعض اِسْتِثْنائی مثالیں موجود ہیں جن میں بعض ڈاکٹر، محققین، انجینئر، اور سائنسدانوں ہی کو اللہ پاک نے اتنی مقبولیت سے نوازا کہ جنہوں نے پہلے علمائے کرام، مفتیانِ کرام اور مشائخ کی صحبت اُٹھائی اور پھر انہی حضرات سے اللہ پاک نے اتنا کام لیا کہ وقت کے بڑے بڑے علمائے کرام نے ان سے فیض حاصل کیا، مثلاً حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کئی خلفاء دنیاوی شعبوں سے وابستہ تھے اور دینی اور دنیاوی شعبوں کا حسین امتزاج تھے، مگر ان مثالوں سے ہم عمومی طور پر یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے اور نہ ہی کرنا چاہیے کہ دین کی تشریح انجینیئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدانوں کے ذمہ ہے اور نہ ہی عمومی سطح پر اس کا اطلاق کرنا چاہیے کہ ایسی پالیساں مرتب کی جائیں کہ آگے آنے والی نسلوں میں یہ اِسْتِثْنائِیَّہ مثالیں عمومیت اختیار کرلیں۔

انجینئر، سائنس دان، ڈاکٹر وغیرہ اپنے شعبہ میں مہارت پیدا کریں

ہمارے ملکِ عزیز میں اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے، یعنی جو انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات ہیں، بجائے اس کے کہ وہ عالمی سائنسی تحقیق میں اپنا نام روشن کریں اور اپنے سائنسی شعبے میں مہارت حاصل کر کے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوائیں اور اُمت کو درپیش جدید مسائل کا متبادل سائنسی حل پیش کریں، وہ اپنی ذمہ داریاں تو تندہی سے انجام نہیں دے رہے، بلکہ ان ہی میں سے بعض انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان حضرات دینی مسائل میں اپنی رائے زنی شروع کردیتے ہیں، یعنی آپ کو بہت سارے انجینئر، پروفیسر، محققین اور سائنسدان ایسے ملیں گے کہ جن کو اُن کے اپنے سائنسی شعبے میں تو مہارت حاصل نہیں اور وہ دینی مسائل میں عوامی سطح پر فتویٰ دینا شروع کردیتے ہیں اور اپنے آپ کو دینی اتھارٹی گردانا شروع کردیتے ہیں۔ یہ بالکل غلط روش ہے اور امُتِ مسلمہ کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ جو

اُمت میں گمراہی پھیلی وہ اسی روش سے پھیلی اور انہی لوگوں کی دینی کم علمی، کم فہمی اور تکبر سے اُمت نے بڑے بڑے فتنے دیکھے۔

دیکھیے! اگر کوئی انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان کسی خاص شعبے کا ماہر ہے اور اس شعبے سے متعلق شرعی حکم معلوم کرنا ہے تو وہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان اس شعبے کی مستند تکنیکی تفصیلات مستند دارالافتاء اور حضرات مفتیانِ کرام کی خدمت میں پیش کرے گا اور پھر یہ حضرات مفتیانِ کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق شرعی حکم بیان فرمائیں، یعنی جواز اور عدمِ جواز کا فیصلہ فرمائیں۔ یہاں ایک بات ضرور ذہن میں رہے کہ مفتیانِ کرام فرماتے ہیں کہ کسی عام شخص کو اپنی صوابدید پر جواز اور عدم جواز بیان کرنے کا حق نہیں ہے، لیکن ایک عام آدمی کو مفتی کی طرف سے جواز اور عدمِ جواز کی حکایت بیان کرنے کا حق ہے، خاص طور پر جب وہ شخص کسی سائنسی شعبے کا ماہر ہو اور اُس کو اس سائنسی ٹیکنالوجی کے معاملات اور اس کی اصل حقیقت کا علم اور ادراک ہو، مثلاً کوئی انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان اپنی طرف سے تحقیق کر کے یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کون سی چیز جائز ہے اور کون سی ناجائز۔ البتہ یہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان، حضرات مفتیانِ کرام سے پوچھ کر اس مسئلہ کے حکم کی حکایت بیان کرسکتا ہے۔

خلاصہ اس بات کا یہ ہوا کہ انجینئر، پروفیسر، محقق اور سائنسدان کا قطعاً یہ کام اور ذمہ داری نہیں کہ وہ خود فتویٰ دینا شروع کردیں اور کسی چیز کی شرعی حیثیت کی وضاحت میں اپنی رائے زنی شروع کردیں، اگر وہ ایسا کریں گے تو وہ اپنے دائرہ کار سے تجاوز کریں گے، اُن کا یہ عمل ضدین کا اجتماع ہوگا اور اُن کا فتویٰ بھی شرعی طور پر معتبر نہیں ہوگا۔ حضرات علمائے کرام یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پروفیسروں، انجینئروں، ڈاکٹروں، اور سائنسدانوں سے دینی مسائل نہ پوچھے جائیں، کیونکہ اُن میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ صحیح دینی مسائل میں اُمت کی رہنمائی کرسکیں۔

شرعی مسائل کے استنباط کا حق کس کو ہے؟

دیکھیے! ہمیں کچھ بنیادی سوالات کے جوابات واضح طور پر معلوم ہونے چاہئیں، مثلاً: کیا شریعت میں ''مفتی مجتہد'' کے علاوہ بھی کوئی شرعی مسائل کا استخراج کرسکتا ہے؟ قرآن وسنت سے مسائل نکال سکتا ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں! کیا ''مفتی مجتہد'' کے علاوہ بھی کسی کے پاس اتنا علمی رسوخ ہوتا ہے کہ وہ شریعت کے مسائل میں اتھارٹی ہو؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے۔ اس بات کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب بھی ہمیں شریعت سے متعلق کوئی حکم جاننا ہوگا، ہم مستند مفتیانِ کرام سے رجوع کریں گے اور انہی سے پوچھے گئے مسائل کی روشنی

میں عمل کریں گے۔

مستند مدارسِ دینیہ میں دارالافتاء میں جدید مسائل میں مختلف موضوعات پر ٹھوس شرعی تحقیق ہوتی ہے۔ ٹھوس شرعی تحقیق سے مراد یہ ہے کہ اس سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کیا جاتا ہے، سائنسی مسئلہ کی ماہیت پر غور کیا جاتا ہے، شرعی تکییف کی جاتی ہے اور پھر کافی غور وخوض اور تحقیق کے بعد اس مسئلہ پر شرعی حکم بتایا جاتا ہے۔ المختصر، قرآنِ پاک کی تفسیر ہو یا شریعت کے احکامات بتانا، احادیث مبارکہ سے مسائل کا استنباط ہو یا مختلف احادیث کی تطبیق، عوام کو مسائل کا حکم شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے بتانا ہو یا دینی علوم میں غور وتدبر، یہ سب کام حضرات علمائے کرام کی ذمہ داریوں میں سے ہیں اور انہی پر جچتے ہیں کہ وہ اس موضوع کے ماہر ہیں۔

اب اس کے برعکس صورتِ حال پر غور فرمایئے۔ کچھ مدارسِ دینیہ میں بعض صاحبانِ علم یہ ذہن سازی کررہے ہیں کہ آپ خود ہی سائنسی مضمون کے ماہر بن جائیں، خود ہی سائنسی موضوع پر تحقیق کریں، اس پر سائنسی مقالے چھاپیں اور پھر اس سائنسی موضوع پر شرعی حکم بتائیں۔ یہ بھی سراسر غلط سوچ ہے اور غلط طریقہ کار ہے کہ فتویٰ کی بنیاد سائنسی موضوع کے ماہرین سے رجوع کیے بغیر ہی رکھی جائے۔ اور یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس سے معاشرے میں جدید مسائل کے حوالے سے تشکیک پیدا ہوجاتی ہے اور علمائے کرام کی رائے میں اختلاف کی بنیاد پڑتی ہے، کیونکہ ایسے علمائے کرام کی سائنسی بنیاد ہی مضبوط نہیں ہوتی، اور وہ سائنسی شعبے کے ماہر نہیں ہوتے اور اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے سائنسدان اور محقق بن گئے ہیں اور انہوں نے ''مفتی'' کے ساتھ ''ڈاکٹر'' کا ٹائٹل بھی حاصل کرلیا ہے، لہٰذا اب وہ خود ہی سائنسدان، معاشی ماہر، اور محقق بن گئے ہیں۔

الحمدللہ! پاکستان کے بیشتر مدارسِ دینیہ اور جمہور مفتیانِ کرام اس ذہن سازی سے متاثر نہیں ہوئے ہیں، بلکہ راقم نے خود کئی بڑے مستند مدارس اور جید مفتیانِ کرام کے عمل کا مشاہدہ کیا، یہ تمام حضرات الحمدللہ سائنسی شعبے کے ماہرین سے ہی سائنسی مسئلہ کی تکنیکی ماہیت سمجھتے ہیں اور پھر جدید مسائل کا حل اُمت کو پیش کرتے ہیں۔

مسائل کا متبادل حل دینے میں احتیاط

آج کل نوجوان علمائے کرام کی ایک ذہن سازی یہ کی جارہی ہے کہ مسائل کا متبادل حل دینا علمائے کرام کی لازمی ذمہ داری ہے۔ دیکھیے اس میں تو دو رائے نہیں کہ متبادل ہونا چاہیے اور بتانا بھی چاہیے اور بعض جید مفتیان کرام مسائل کا جواب دیتے وقت متبادل بھی بتا دیتے ہیں اور سائل کو نصیحت بھی فرما دیا

کرتے ہیں اور ان حضرات میں ہمارے محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ نے اپنے دور میں اکابر اہلِ افتاء کی ایک جماعت کے ذریعہ یہ خدمت انجام دی تھی، جس کے بنیادی خطوط اور خاکے محفوظ ہیں۔ مگر متبادل حل دینے کی آڑ میں ناجائز کو جائز تو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ متبادل نصوص کے احکامات کے ذیل میں ہونا چاہیے، یعنی مثلاً شراب حرام ہے، زنا حرام ہے، سُود حرام ہے تو کیا مسلمان مفتیانِ کرام کے ذمہ فرض ہے کہ وہ زنا، شراب، اور سُود کا متبادل دیں؟ بھئی متبادل تو شریعت نے پہلے ہی سے بتادیا ہے، مثلاً زنا کا متبادل نکاح ہے، شراب کا متبادل دودھ یا کسی پھل کا جوس ہے، اور سُود کا متبادل کاروبار ہے، مگر متبادل ڈھونڈتے وقت یہ کہنا کہ نہیں ہم نے ہر حال میں متبادل دینا ہے اور شریعت کے اصولوں کو بالائے طاق رکھنا ہے، کسی صورت بھی مناسب نہیں، مثلاً سُود کا متبادل دیتے وقت سُود ہی کی کسی نئی شکل کو جائز قرار دینا کسی صورت بھی قابلِ قبول نہ ہوگا۔ شراب کا متبادل دیتے وقت کسی نئی قسم کی شراب ہی کو جائز قراد دے دینا کسی صورت قابلِ قبول نہ ہوگا۔ آپ ہی انصاف فرمائیے کہ کیا اس طرح کے متبادل قابلِ قبول ہوں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں! لہٰذا متبادل کی تلاش میں مسلمان مفتیانِ کرام پر ہرگز یہ لازم نہیں کہ وہ زبردستی حرام اور ناجائز چیزوں کو جائز وحلال بتلائیں۔

اسی تناظر میں ذیل کے اقتباسات بہت اہم ہیں:

①: ’’بہرحال ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے کہ فقہ اسلامی کی جدید تدوین کے ذریعہ جو قرآن وسنت اور حضرت حق جل ذکرہٗ اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منشا کے مطابق صالحین کے موروثہ اثاثہ کی روشنی میں کی جائے، جدید پیدا شدہ مسائل کا حل تلاش کرکے فیصلہ کردینا چاہیے، تاکہ دینِ اسلام کا مضبوط اور حسین وجمیل قلعہ قیامت تک اعداء اور اغیار کے حملوں سے محفوظ رہے۔ مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ ہم یورپ کے جدید معاشی و اقتصادی نظام اور معاشرتی نظام کو پہلے ہی اپنا لیتے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ جوں کا توں یہ پورا نظام اسلام کے اندر فٹ ہوجائے، یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘

(دینی مدارس کی ضرورت اور جدید تقاضوں کے مطابق نصاب و نظامِ تعلیم، انتخاب از مقالات محدث العصر حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری قدس سرہٗ، جمع وترتیب: مولانا محمد انور بدخشانی صاحب مدظلہٗ، صفحہ: ۱۴۲)

②: ’’فقہاء کرام نے فرمایا کہ ’’جو آدمی اپنے اہلِ زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی اہلِ زمانہ کے طرزِ زندگی، ان کی معاشرت، ان کے معاشی معاملات اور ان کے مزاج و مذاق سے واقف نہ ہو) تو وہ جاہل ہے۔‘‘ ایک عالم کے لیے جس طرح قرآن وسنت کے احکام سے واقف ہونا

ضروری ہے، اسی طرح اس کے لیے زمانہ کے ''عرف'' اور زمانہ کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جا کر تاجروں کے پاس بیٹھتے، اور ان کے معاملات کو سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا، وہ صرف یہ جاننے کے لیے ان تاجروں کے پاس بیٹھتے تھے کہ ان کے کیا طریقے ہیں؟ اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لیے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے تو وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو، اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا..... بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب کسی علاقے یا معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا، بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے، اس لیے اس کا کام اس حد پر جا کر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، بلکہ بحیثیت داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کو ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابلِ عمل بھی ہونا چاہیے اور شریعت کے احکام کے مطابق بھی۔'' (مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ادارۃ المعارف، کراچی)

متبادل حل دینے میں خلطِ مبحث اور متبادل حل دینے میں علماء کرام کا دائرہ کار

متبادل دینے کی آڑ میں بعض صاحبانِ علم خَلْطِ مَبْحَث کر چکے ہیں۔ دیکھیے! متبادل کی ایک بڑی وسیع تعریف ہوسکتی ہے۔ اگر شرعی تکییف کر کے یہ بتا دیا جائے کہ سُود حرام ہے اور آپ سُود سے بچیں، تو یہ تو حکم بتانے کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر یہ بتا دیا جائے کہ آپ سُود کے بدلے تجارت کرلیں تو یہ متبادل دینا کہلائے گا۔ لیکن اگر مسائلِ جدیدہ میں متبادل دینے سے مُراد یہ ہے کہ حضرات علمائے کرام اپنے دائرہ کار سے ہی باہر نکل کر کام کریں تو یہ ہرگز مناسب نہ ہوگا، اس کو دو مثالوں سے سمجھتے ہیں:

متبادل حل دینے میں علماء کرام کے دائرہ کار کی پہلی مثال: حرام اجزاء پر مشتمل دوا

فرض کریں کہ ایک دوائی ہے جس کو بنانے میں خنزیر یعنی سور کے خلیے استعمال کیے گئے ہیں، اب

اس کا حکم بتاتے وقت یہ کہا جائے کہ اس کو استعمال کرنا منع ہے تو یہ حکم بتانے کے زمرے میں آئے گا، جیسا کہ درجِ ذیل ہے:

’’کسی بھی حرام چیز کو بطورِ دوا استعمال کرنا بھی حرام ہے، الا یہ کہ بیماری مہلک یا ناقابلِ برداشت ہو اور مسلمان ماہر دین دار طبیب یہ کہہ دے کہ اس بیماری کا علاج کسی بھی حلال چیز سے ممکن نہیں ہے اور یہ یقین ہو جائے کہ شفا حرام چیز میں ہی منحصر ہے، اور کوئی متبادل موجود نہیں ہے تو مجبوراً بطورِ دوا و علاج بقدرِ ضرورت حرام اشیاء کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے، ورنہ نہیں۔‘‘ (فتویٰ نمبر:144110200078، دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن)

پھر اس کا متبادل دے دیا جائے کہ آپ اس حرام اجزاء والی دوائی کے بجائے فلاں حلال اجزاء والی دوائی استعمال کر لیجیے تو یہ بات بھی عقل میں آتی ہے، مگر یہ مفتیانِ کرام کا دائرہ کار نہیں کہ وہ ہر دوائی سے متعلق تحقیق کریں کہ فلاں دوائی کا متبادل کون کون سی دوائیاں ہیں؟ یہ سائل ہی کے ذمہ ہے کہ وہ حضرات مفتیانِ کرام سے پوچھ پوچھ کر مسلمان ماہر دین دار طبیب سے پوچھ کر متبادل تلاش کرے۔ مسئلہ تب شروع ہوتا ہے کہ جب نوجوان مفتیانِ کرام کی ذہن سازی کی جائے اور اُن کو اس بات کی ترغیب دی جائے کہ آپ خود تحقیق کیجیے اور جدید طبی علوم کو سیکھیے اور پھر سیکھ کر اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل دیجیے، یعنی نوجوان مفتیانِ کرام بذاتِ خود ایم بی بی ایس MBBS کریں، پھر ایم ڈی M.D کریں اور پھر کلینیکل پریکٹس کریں اور طبی دواؤں پر لیبارٹری میں تحقیق کریں اور پھر حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل دیں، یعنی مدارسِ دینیہ کے اندر طب کی تحقیق سے متعلق شعبے قائم ہوں، جس کے اندر اس مسئلے پر تحقیق کی جائے اور امت کو نئی دوائی بنا کر اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل پیش کیا جائے جو کہ امت کی ضرورت کا حل ہو۔

ہماری گزارش ہوگی کہ یہ مسلمان علمائے کرام اور مدارس کی قطعاً ذمہ داری نہیں کہ وہ اس طرح کی تحقیق کریں، بلکہ یہ تو اُن کے دائرہ کار ہی میں نہیں آتا اور جو صاحبانِ علم اس طریقے کی ذہن سازی کر رہے ہیں، ان کو خَلْطِ مَبْحث ہو چکا ہے۔ اس میں تو کوئی دو رائے نہیں کہ امتِ مسلمہ کو اس حرام اجزاء والی دوائی کا متبادل ملنا چاہیے، مگر یہ ذمہ داری کس کی ہے؟ اس کا تعین ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو یہ مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ مسلمانوں کے لیے حلال اجزاء والی دوائیاں ملک میں درآمد کرے اور عالمی دوا ساز کمپنیوں سے گفت وشنید کرے، تاکہ عالمی دوا ساز کمپنیاں مسلمان ممالک میں حلال اجزاء والی دوائیاں ہی بھیجیں، اس کے لیے مسلمان ممالک او آئی سی کا فورم بھی متحرک کر سکتے ہیں۔ نیز ملک کے اندر حکومتی حلال کمیٹیوں کے ذریعے بھی اس کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ اصولی طور پر تو مسلمان ممالک کو

سائنس میں اتنی ترقی کرنی چاہیے کہ وہ خود ایسی دوائیاں ملک کے اندر بنائیں اور یہ مسلمان سائنسدانوں اور محققین کا کام ہے کہ وہ ایسی سائنسی تحقیق کریں جس سے امت کی ضرورت کو پورا کیا جائے اور متبادل حل پیش کرنا مسلمان سائنسدانوں اور اس متعلقہ شعبے کے ماہرین کی ہی ذمہ داری ہے۔

متبادل حل دینے میں علماء کرام کے دائرہ کار کی دوسری مثال: یوٹیوب کی کمائی

متبادل حلال طریقہ بتاتے وقت علمائے کرام کا دائرہ کار کیا ہوگا؟ اس کو ایک اور مثال سے سمجھتے ہیں، جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ علمائے کرام کو معاملات کی خبر ہونی چاہیے، مگر اس سے قطعاً یہ مراد نہیں ہے کہ وہ خود ہی ماہر بن جائیں۔ نیز اتنی استعداد حضرات مفتیانِ کرام میں ہونی چاہیے کہ وہ زیرِنظر مسئلہ کی باریکیوں کو بھی سمجھ سکیں، تاکہ مسئلہ کی شرعی تکییف میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، مثلاً اگر ایک سوال دارالافتاء میں آیا کہ یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کا کیا حکم ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں تحقیق اور مشاہدے کے بعد حضرات مفتیانِ کرام یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی سے اجتناب کا کہتے ہیں۔

یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کے سوال کا جواب بتاتے وقت مفتیانِ کرام نے یہ طریقہ کار اختیار کیا کہ سب سے پہلے وہ کمپیوٹر سائنس کے ماہرین سے رجوع کر کے سمجھیں گے کہ یوٹیوب پر اشتہارات کس طریقے سے کام کرتے ہیں، ان اشتہارات پر کس کا کنٹرول ہوتا ہے، یوٹیوب پر جب کوئی مونیٹائیزیشن (اشتہارات وغیرہ سے پیسے کمانا) شروع کرے گا تو اس میں کن کن عوامل کی بنیاد پر اشتہارات چلیں گے، جیسے جغرافیائی محل وقوع، سرچنگ ہسٹری، وغیرہ۔ نیز جب یوٹیوب پر کوئی اکاؤنٹ کھول رہا ہے تو وہ کیا معاہدہ کر رہا ہے؟ اس میں کون کون سی بنیادی شقیں ہیں جن کو صارف نے قبول کیا ہے؟ پھر مفتیانِ کرام مختلف قسم کے اشتہارات کی اقسام کو دیکھیں گے، پھر جب کمپیوٹر سائنس کے ماہرین سے رجوع کرنے کے بعد، تحقیق اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ویڈیو بنانے والے کو اس بات کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی کے اشتہار چلانے پر یوٹیوب کو پابند کرے، اور اکثر اوقات یہ اشتہارات غیر شرعی چیزوں پر مشتمل ہوتے ہیں، اور اس کے علاوہ بھی ان اشتہارات میں کئی مفاسد ہوتے ہیں، جیسے میوزک، نامحرم کی تصاویر، اور جاندار کی تصاویر وغیرہ۔ تو ان تمام باتوں کا احاطہ کرنے کے بعد مفتیانِ کرام یوٹیوب کے اشتہارات سے ہونے والی کمائی کا حکم بتائیں گے جو کہ اس سے اجتناب کا ہے۔

اب جب حلال متبادل حل دینے کی بات آئی تو حضرات مفتیانِ کرام یہ کہیں گے کہ سائل کے ذمہ

لازمی تھوڑی ہے کہ یوٹیوب کے ذریعے ہی اشتہارات سے کمائی کرے، سائل کو چاہیے کہ وہ کسی اور حلال طریقۂ کاروبار سے کمائی کرلے۔ کوئی بھی مفتیانِ کرام سے یہ توقع نہیں رکھے گا کہ پہلے وہ کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کریں، پھر کئی سال کمپیوٹر سائنس میں عالمی معیار کی تحقیق کریں اور پھر اس مسئلہ کا جواب دیں۔ نیز کوئی بھی مفتیانِ کرام سے یہ توقع نہیں رکھے گا کہ خود مفتیانِ کرام ہی یوٹیوب کا متبادل دیں، یعنی یوٹیوب سے ملتا جلتا اسٹریمنگ پلیٹ فارم بنائیں جس میں نہ میوزک ہو، نہ نامحرم کی تصاویر ہوں، نہ جاندار کی تصاویر ہوں اور نہ ہی کوئی دوسرا شرعی محظور ہو، بلکہ اگر کوئی مفتی صاحب ایسا کریں گے تو وہ اپنے دائرہ کار اور حدود سے تجاوز کریں گے، کیونکہ یوٹیوب کا متبادل حل دینا کمپیوٹر سائنسدانوں کے دائرہ کار میں آتا ہے اور یہ اسلامی حکومتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ متعلقہ محکموں کے ذریعے سے یوٹیوب جیسے متبادل پلیٹ فارمز کا اجراء کریں جن میں شرعی قباحتیں موجود نہ ہوں۔

جس طریقے سے اگر کوئی سائنسدان، محقق، پروفیسر اور انجینئر اپنے شعبے کے دائرہ کار سے نکلے گا اور اپنے شعبے سے نکل کر شریعت کی باتوں میں دخل دے گا، قرآن وحدیث کی من مانی تشریح کرے گا، اور خود ہی فقہی احکامات نکالنے شروع کرے گا تو اس سے گمراہی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ بعینہٖ اگر نوجوان مفتیانِ کرام تحقیق کے نام پر خود ہی سائنسدان، محقق، انجینئر اور پروفیسر بن جائیں گے اور سائنس کے شعبے میں رائے زنی کریں گے تو اس کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟

خلاصہ یہ کہ متبادل بتانا مفتی کی ذمہ داری ہے، لیکن متبادل بنانا نہ صرف یہ کہ اس کے فرائض اور دائرہ کار سے خارج ہے، بلکہ حرام بھی ہے۔

الحاصل پوری تفصیل کا مقصد یہ ہوا کہ علمائے کرام اور سائنسدانوں کے ذمہ لازم ہے کہ وہ اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کریں اور اپنے فرائضِ منصبی نبھائیں، یعنی جو ذمہ داریاں حضرات علمائے کرام اور مفتیانِ کرام کی ہیں وہ اُن پر کاربند رہیں اور جو سائنسدانوں، محققین، پروفیسر اور انجینئر حضرات کی ذمہ داریاں ہیں، وہ اُن ذمہ داریوں کو پوری تندہی کے ساتھ انجام دیں۔ اسی سے معاشرہ اِفراط وتفریط سے بچے گا اور ترقی کرے گا۔ اگر علمائے کرام اور سائنسدان اپنے اپنے دائرہ کار سے تجاوز کریں گے تو اسی سے معاشرے میں اَبتری پھیلے گی اور خَلْطِ مَبْحَث پیدا ہوگا۔ اللہ پاک امتِ مسلمہ کی ہر قسم کے فتنوں اور گمراہی سے حفاظت فرمائیں، آمین۔

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں قانونی تنظیم!

ڈاکٹر ساجد خاکوانی
اسلام آباد

دنیا کی تاریخ بادشاہوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک قابل اور ایک سے بڑھ کر ایک نااہل ترین حکمرانوں نے اس دنیا کی تاریخ میں اپنے نام کھرچے، لیکن گنتی کے چند حکمران گزرے ہیں جو بذاتِ خود قانون ساز تھے اور انہوں نے صرف حکمرانی ہی نہیں کی، بلکہ انسانیت کو جہاں قانون سازی کے طریقے بتائے، وہاں قوانینِ حکمرانی و جہانبانی بھی بنائے۔ ایسے حکمران انسانیت کا اثاثہ تھے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خلیفہ ثانی اُنہی حکمرانوں میں سے ہیں، جنہوں نے عالم انسانیت کو وحیِ الٰہی کے مطابق قوانین بنا کر دیئے اور قانون سازی کے طریقے بھی تعلیم کیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ: ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتا۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول کو سچ کر دکھایا اور حدود اللہ سے لے کر انتظامِ سلطنت تک میں اس طرح کی قانون سازی کی کہ آج اکیسویں صدی کی دہلیز پر بھی سائنس اور ٹیکنالوجی اور علوم و معارف کی دنیاؤں میں آپؓ کے بنائے ہوئے قوانین ''عمر لا (Umar Law)'' کے ہی نام سے رائج و نافذ ہیں اور عالمِ انسانیت تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیض عام پہنچ رہا ہے۔

دنیا کے دیگر بادشاہوں نے جو کچھ بھی قانون بنائے وہ اپنی ذات، نسل، خاندان یا اپنی قوم و ملک کے مفادات کے تحفظ کے لیے بنائے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بنائے ہوئے قوانین میں خالصتاً شریعتِ اسلامیہ کے فراہم کیے ہوئے اصول و مبادی شامل تھے۔ باقی بادشاہوں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قانون سازی میں ایک اور بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ باقی بادشاہوں کے قوانین ایک دفعہ بننے کے بعد ان بادشاہوں کی اَنا کا مسئلہ بن جاتے، اور کوئی بادشاہ بھی ان قوانین میں تبدیلی کو اپنی اَنا و خودی کی تذلیل سمجھتا، جب کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی اپنی قانون سازی کے برخلاف کوئی نص میسر آتی تو آپ فوراً رجوع کر لیتے اور

کبھی بھی اپنی اَنا کے خول میں گرفتار نہ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک تمام اسلامی مکاتبِ فکر میں آپ کے فیصلوں کو قانونی نظیر کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قانون سازی کا سب سے پہلا اصول کتاب اللہ سے استفادہ تھا۔ آپؓ نے اپنے دورِ حکمرانی میں متعدد گورنروں کو جو خطوط لکھے، ان میں سب سے پہلے قرآن مجید سے استفادہ کا حکم لکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قرآن فہمی کی سب سے عمدہ مثال ایران و عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں آپ کا اجتہادی فیصلہ تھا۔ معروف طریقے کے مطابق ان زمینوں پر مجاہدین کا حق تھا کہ ان میں یہ زمینیں تقسیم کردی جاتیں، لیکن اگر مجاہدین بیلوں کی دم تھام لیتے اور زمینوں کی آبادکاری پر جت جاتے تو دنیا میں اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے ذریعے شہادتِ حق کا فریضہ پس پشت چلا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی دور بین نگاہوں نے اس کا حل قرآن مجید کے اندر سورۂ حشر کی ان آیات میں تلاش کرلیا:

''وَ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّ لَا رِكَابٍ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ اَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّ يَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ'' (المائدۃ:۶-۱۰)

ترجمہ: ''جو کچھ اللہ تعالیٰ نے (اس طور پر) اپنے رسول کو دوسری بستیوں کے (کافر) لوگوں سے دلوادے (جیسے فدک اور ایک حصہ خیبر کا) سو وہ (بھی) اللہ کا حق ہے اور رسول کا اور (آپ کے) قرابت داروں کا اور یتیموں کا اور غریبوں کا اور مسافروں کا، تاکہ وہ (مالِ فئے) تمہارے تونگروں کے قبضے میں نہ آجاوے۔ اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں (اور بعمومِ الفاظ یہی حکم ہے افعال اور احکام میں بھی) تم رک جایا کرو اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ تعالیٰ (مخالفت کرنے پر) سخت سزا دینے والا ہے۔ اور ان حاجت مند مہاجرین کا (بالخصوص) حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے

مالوں سے (جبراً وظلماً) جدا کر دیے گئے، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل (یعنی جنت) اور رضامندی کے طالب ہیں۔ اور وہ اللہ اور رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں (اور) یہی لوگ (ایمان) کے سچے ہیں۔ اور (نیز) ان لوگوں کا (یہی حق ہے) جو دار الاسلام (یعنی مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے (آنے کے) قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے، اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں، اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو اور (واقعی) جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جاوے ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور ان لوگوں کا (بھی اس مالِ فئے میں حق ہے) جو اُن کے بعد آئے جو (ان مذکورین کے حق میں) دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو (بھی) جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کینہ نہ ہونے دیجئے، اے ہمارے رب! آپ بڑے شفیق رحیم ہیں۔ ''

پس ان آیات سے حضرت عمرؓ نے بڑی باریک بینی سے استنباطِ قانون کیا اور جسے مالِ غنیمت یعنی جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والا مال سمجھا جا رہا تھا اور جس کی تقسیم کے لیے امیر المومنین پر بہت زیادہ دباؤ تھا، آپؓ نے اسے مذکورہ نصِ قرآنی سے ''مالِ فے'' یعنی بغیر لڑائی کے حاصل ہونے والا مال ثابت کیا اور قرآن کے مطابق اس مال میں چونکہ بعد میں آنے والوں کا حصہ بھی شامل ہے، اس لیے مجاہدین میں تقسیم کرنے سے انکار کر دیا۔

شریعتِ اسلامیہ میں کتاب اللہ کے بعد دوسرا سب سے بڑا ماخذ و قانون سنتِ رسول اللہ ﷺ ہے۔ کم و بیش دس سالہ مدتِ اقتدار میں متعدد بار حضرت عمرؓ نے حدیث نبوی ﷺ کے مل جانے پر اپنی رائے سے رجوع کر لیا تھا۔ اطاعتِ رسول ﷺ کی اس سے اور عمدہ مثال کوئی نہیں ہو سکتی۔ حضرت سعید بن مسیبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر ﷺ نے ہاتھ کے انگوٹھے کی دیت پندرہ اونٹ مقرر کی تھی، جب کہ باقی انگلیوں کی مقدارِ دیت اس سے کم تھی، حضرت عمرؓ کا موقف تھا کہ انگوٹھا چونکہ زیادہ کارآمد ہوتا ہے، اس لیے اس کی دیت بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ لیکن جب عمرو بن حزمؓ کے ہاں سے ایک تحریر دریافت ہوئی، جس میں آپ ﷺ کے حوالے سے نقل کیا گیا تھا کہ ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہے تو حضرت عمرؓ نے بلا چوں و چرا اپنی اجتہادی و قیاسی رائے سے رجوع کر لیا اور حدیث نبوی ﷺ کے مطابق مقدمات کے فیصلے جاری فرمائے۔

اسی طرح جب شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی اور مسلمانوں کا ایک بہت بڑا لشکر حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کی کمانداری میں وہاں موجود تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بن جراح کے درمیان ایک نزاع چل پڑی کہ لشکر کو قیام کا حکم دیا جائے یا خروج کا؟ ابھی یہ نزاع جاری تھی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پیش کردی کہ: ''جب تم سنو کہ فلاں علاقے میں وبا ہے تو تم وہاں نہ جاؤ اور اگر تمہارا قیام ایسے علاقے میں ہے جہاں وبا پھوٹ پڑی ہو تو وہاں سے مت بھاگو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) سن کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور حکمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں قبولیتِ حدیث کا معیار بھی بہت سخت تھا۔ ایک بار آپؓ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو بلا بھیجا، کافی دن گزر گئے تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: میں نے آپ کو بلایا تھا تو آپ کیوں نہیں آئے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں آیا تھا، تین بار دروازہ بجایا، آپ نہیں نکلے تو میں لوٹ آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وجہ پوچھی تو حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے اپنے اس عمل کے جواز میں حدیثِ نبوی پیش کردی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو اس وقت تک قبول کرنے سے انکار کردیا جب تک کہ کوئی گواہ نہ ہو، اس پر حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو دو گواہ لانے پڑے۔

تعاملِ حدیث کے معاملے میں اپنی اولاد سے بھی رعایت نہیں کرتے تھے، ایک بار لختِ جگر نے کہا کہ مجھے تو کدو پسند نہیں ہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیٹے سے ناراض ہوگئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ سبزی کے بارے میں بیٹے نے ایسی رائے کیوں دی؟ پھر تین دن کی مدت ختم ہونے سے پہلے خود ہی ناراضگی ختم کردی کہ تین دن سے زائد ناراضگی سے ایک حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں منع کیا گیا ہے۔

مشاورت کا طریقہ اجماعِ امت تک پہنچنے کا بہترین راستہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں حکومت کی کامیابی کی ایک بہت بڑی وجہ مشاورت بھی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشاورت دو وجوہات سے جداگانہ تھی، ایک تو ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اہل الرائے افراد کو جمع کرکے ان سے رائے لی جاتی۔ ایک اعلان کرنے والا دارالخلافہ کی گلیوں میں ''یاأیها الجماعة'' کے اعلان کے ساتھ گھومتا چلا جاتا اور عمائدینِ ریاست مسجد میں جمع ہوجاتے۔ بہت چھوٹے چھوٹے معاملات بھی جن میں کہ حکمران کو صوابدیدی اختیارات حاصل ہوتے، ان میں بھی مشاورت کی جاتی اور نتیجے کے طور پر معاملات کے حل کی متعدد صورتیں سامنے آجاتیں اور پھر اتفاقِ رائے یا کثرتِ رائے سے بہترین فیصلے تک پہنچ جایا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مشاورت کی دوسری اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ خلیفۂ وقت خود ایک رائے دہندہ کی حیثیت سے شریکِ مشورہ ہوتا تھا اور اپنی رائے کے برخلاف فیصلہ پر بھی تیوری نہ چڑھائی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رائے دینے والے خلیفہ کے رعب و دبدبے کے باوجود کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ امیر المومنین نہ صرف یہ کہ اپنی مخالفت پر خفگیں نہیں ہوں گے، بلکہ اچھا اور صائب مشورہ دینے پر حکمرانِ وقت اپنی رائے واپس بھی لے لے گا اور کسی طرح کی بدمزگی بھی پیدا نہیں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس رویے نے ان کے دورِ حکومت کو چار چاند لگائے۔

دورِ فاروقی میں جب مے نوشی کے واقعات کثرت سے وقوع پذیر ہونے لگے تو اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود کوئی بھی حکم دے کر اس کا سدِ باب کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کو مشورے کے لیے بلا بھیجا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالتِ مخمور میں ہزیان بکنے والے کے منہ سے بہتان تراشی کے اندیشے پر قیاس کرتے ہوئے حدِ قذف کے اِجراء کی سفارش کی۔ کل صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس رائے سے اتفاق کیا، جس سے شراب نوشی کی حد کو حدِ قذف سے ہی محدود کر دیا گیا، یعنی اسّی دُرّے۔ کل حدود اللہ کا تعلق نصِ قرآنی سے ہے، لیکن چونکہ اجماعِ صحابہؓ قرآن مجید کے برابر مانا جاتا ہے، کیونکہ قرآن مجید کی جمع و تدوین اجماعِ صحابہؓ کا ہی ثمرہ ہے، اس لیے اجماعِ صحابہؓ کے نتیجے میں شراب نوشی کی سزا کو بھی حدود اللہ میں شامل ہونے کا درجہ حاصل ہے۔

سلطنتِ ایران کے ساتھ جہاد کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شدید خواہش تھی کہ وہ خود اس جنگ کی قیادت کریں، اس لیے کہ شرق و غرب کے کل عساکرِ اسلامیہ اس جنگ میں جھونک دیے گئے تھے، ناکامی کی صورت میں زوالِ کلیہ کا مکروہ چہرہ دیکھنے کا امکان تھا، چنانچہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود افواجِ اسلامیہ کی کمانداری کرنا چاہتے تھے، لیکن اس موقع پر بھی اجتماعی مشاورتی رائے کے سامنے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سپر ڈال دی، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ مرکزِ خلافت کو کسی صورت خالی نہ چھوڑا جائے۔

ایک بار جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ رات کو گشت کر رہے تھے تو ایک گھر سے فراق کے نغموں کی نسوانی آواز آئی، اگلے دن تحقیق کی تو معلوم ہوا اس عورت کا شوہر محاذِ جنگ پر گیا تھا۔ آپؓ نے اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ شوہر کے بغیر چار ماہ تک عورت صبر کر سکتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی وقت یہ حکم جاری کیا کہ چار ماہ کے بعد ہر فوجی کو جبری رخصت پر گھر بھیجا جائے۔

مشاورت کا عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر عزیز تھا کی آپؓ نے اپنے پورے دورِ حکومت میں

صحابہ کبار رضی اللہ عنہم اور عمائدینِ قریش کو دارالحکومت سے باہر کا سفر نہیں کرنے دیا، صرف حج کی اجازت تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کا یہ فائدہ ہوا کہ صائب الرائے حضرات کی ایک معقول تعداد صباح ومساء آپؓ کے قریب موجود رہتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مشورہ دینے والے ہی حکمرانوں کو ڈبوتے بھی ہیں اور پار بھی لگاتے ہیں، پس اب یہ حکمران پر منحصر ہے کہ خوشامدیوں کو شریکِ مشورہ کرے اور قوم کی لٹیا ڈبودے یا نقادوں کے تندوتیز نشتروں کا سامنا کرے اور آسمانِ دنیا پر سورج اور چاند کی طرح جگمگائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ذاتی قیاس واجتہاد سے بھی قانون سازی کرتے تھے، لیکن اجتہاد کا یہ عمل قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہؓ کی حدود کے اندر ہوتا تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ذمیوں پر قابلِ برداشت ٹیکس عائد کیا اور جو ذمی بوڑھا ہوجاتا اور ٹیکس دینے کے قابل نہ رہتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سرکاری بیت المال سے اس کا وظیفہ بھی مقرر فرمادیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے مفقود الخبر شوہر کی منکوحہ کو اس وقت تک عقدِ ثانی کی اجازت نہ تھی جب تک کہ اس کے شوہر کے ہم عمر فوت نہ ہوجائیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اجتہادی رائے سے ایسی عورت کے لیے چار سال کے انتظار کو کافی سمجھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجتہادی رائے تھی جب بھوکے غلاموں نے اونٹنی چوری کرکے کھائی تو ان غلاموں کی حد ساقط کردی اور ان کے آقا سے دوگنا تاوان وصول کیا۔ حدود کا اجراء خالصتاً حاکمِ وقت کی ذمہ داری ہے، لیکن وسعتِ سلطنت کے باعث آپؓ نے اجتہاداً یہ اختیار اپنے نائبین کو تفویض کردیا تھا، سوائے ان حدود کے جن کی سزا میں زندگی کا خاتمہ شامل تھا۔

اسی طرح نومفتوحہ علاقوں میں حدود اللہ کے اجراء کو علم سے مشروط کردیا تھا، یعنی حدود سے لاعلم شخص پر حد جاری نہیں کی جاتی تھی۔ آپؓ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ پہلے حدود اللہ کے بارے میں لوگوں کو بتاؤ اور اس کے بعد اگر کوئی ارتکابِ جرم کرتا ہے تو اس پر حد جاری کرو۔ ایک اور واقعہ میں یحییٰ بن حاطب کی آزاد کردہ لونڈی ''مرکوش'' لوگوں سے کہتی پھر رہی تھی کہ میں نے زنا کیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورے سے کوڑوں کی سزا دی اور رجم نہیں کیا، کیونکہ اسے حدِ زنا کا علم نہیں تھا۔

امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے یہ اصولِ قانون سازی آج بھی زندہ ہیں اور لوگ آسمانِ رسالت کے اس چمکتے دمکتے ستارے سے آج بھی روشنی حاصل کررہے ہیں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

حج کی خوشی میں دعوت کرنا اور پھولوں کا ہار پہنانا

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

حاجی لوگ جب حج کر کے آتے ہیں، وہ آنے کی خوشی میں کھانے کی دعوت رکھتے ہیں، ان کا کھانا کھانا کیسا ہے؟ اوران کو پھولوں کا ہار ڈالنا کیسا ہے؟ مستفتی: محمد سہیل

الجواب حامدًا و مصليًا

صورتِ مسئولہ میں حاجی حج سے آکر جو دعوت کرتے ہیں تو چونکہ یہ ایک خوشی کا موقع ہوتا ہے، اس لیے یہ دعوت کرنا بنفسہٖ مباح عمل ہے، اور اس دعوت کا کھانا کھانا بھی درست ہے، بشرطیکہ دعوت اخلاص کے ساتھ ہو، اظہارِ تشکر کے طور پر ہو، ریا کاری نہ ہو، اس دعوت میں خلافِ شرع کسی کام کا ارتکاب نہ ہو اور اس دعوت کو ضروری نہ سمجھا جاتا ہو، اس دعوت میں اِسراف نہ ہو۔

باقی خوشی کے اس موقع پر حاجی کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالنا بھی ایک مباح عمل ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

’’والمباح: ما أجيز للمكلفين فعلهٗ وتركهٗ بلااستحقاق ثواب وعقاب.‘‘

(فتاویٰ شامی، ج:۶،ص:۳۳۶، ط:سعید)

اعلاء السنن میں ہے:

’’وقال بعض الفقهاء من أصحابنا وغيرهم أن الوليمة تقع علىٰ كل طعام

لسرور حادث، إلا أن استعمالها في طعام العرس أكثر....
فحكم الدعوة للختان وسائر الدعوات غير الوليمة إنها مستحبة لما فيهما من إطعام الطعام والإجابة إليها مستحبة غير واجبة.''

(اعلاء السنن، ج:۱۲،ص:۱۶،۱۷، ط:ادارۃ القرآن)

فقط واللہ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	مدثر عباسی
الجواب صحیح		تخصصِ فقہِ اسلامی
محمد داؤد		جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

نَقدُ و نظَر

ادارہ

امام اعظم ابوحنیفہؒ.... شہیدِ اہلِ بیتؓ

مؤلف: مفتی ابوالحسن شریف اللہ الکوثری۔ صفحات: ۱۷۶۔ طباعت: سوم۔ زیرِ اہتمام: سید زید الحسینی۔ ملنے کا پتا: مکتبہ سید نفیس الحسینی لاہور، خانقاہ سید احمد شہیدؒ، سگیاں پل، الجنت روڈ، اور نفیس منزل، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور۔ رابطہ نمبر:0321-4791991

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح اور فضائل ومناقب پر شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اسی موضوع پر ایک اچھوتی کاوش ہے، جو آپؒ کی زندگی کے اس پہلو کو اُجاگر کرتی ہے جب آپ علَمِ جہاد کے علمبردار تھے۔ آپؒ کی زندگی میں ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق بلند کرنے کے دو مواقع پیش آئے، ایک اس وقت جب ہشام بن عبدالملک کے خلاف حضرت امام زید بن علی زین العابدین بن امام حسین رضی اللہ عنہم نے خروج کیا، اور دوسرا اس وقت جب ابوجعفر منصور عباسی کے سامنے حضرت امام ذوالنفس الزکیہ محمد بن عبداللہ بن حسن بن امام حسن اور ان کے بھائی حضرت ابراہیم حسنی رضی اللہ عنہم نے علَمِ بغاوت بلند کیا۔

حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں مواقع پر ائمہ سادات کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا اور اپنے حلقۂ درس میں اُن کے حق پر ہونے کی گواہی بھی دی، جب اس بات کی خبر عباسی بادشاہ ابوجعفر منصور کو ہوئی تو اس نے آپؒ کو اپنا موافق بنانے کے لیے عہدۂ قضا کی پیشکش کی، لیکن آپؒ نے انکار فرمادیا، جس پر طیش میں آکر اس نے آپؒ کو زندان میں ڈلوادیا اور وہیں آپؒ کو زہر دے کر شہید کرادیا۔

حضرت امام اعظمؒ کے اس عمل کی وجہ سے آپ کو ''شہیدِ اہل بیتؓ'' کہا گیا ہے کہ آپ نے ائمہ اہلِ بیت اطہارؓ کی محبت ونصرت میں جان، جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

زیرِتبصرہ کتاب میں آپؒ کی زندگی کے اس پہلو پر اُمہات الکتب و بنیادی مآخذ کے حوالہ جات کی روشنی میں مفصل کلام کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں حضرات اہلِ بیت اطہارؓ کے فضائل ومناقب اور صحابہ کرامؓ و اہلِ بیتؓ کے درمیان مثالی تعلقات پر ضروری مواد شامل ہے۔ اس کے بعد امام اعظمؒ کی ولادت سے شہادت تک وہ تمام ضروری مواد اکٹھا کردیا گیا ہے، جو آپؒ کو بلاشبہ ''شہیدِ اہل بیتؓ'' کا مصداق ٹھہراتا ہے۔

یہ کتاب عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے سابق نائب امیر مرکزیہ، خانقاہ رائے پور کے گل سرسبد سید السادات حضرت اقدس مولانا سید نفیس الحسینی شاہ نوراللہ مرقدہٗ کی فکر کا نتیجہ ہے، جب کہ اس پر عالمی مجلس مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے امیرِ مرکزیہ ہفتم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالمجید لدھیانویؒ اور ماہنامہ بینات کے مدیر حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہیدؒ کی تائیداُن کی تقریظات کی صورت میں ثبت ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو اس کاوش پر جزائے خیر عطا فرمائے اور ہم سب کو آنحضرت ﷺ اور آپ کے اہلِ بیت اطہارؓ اور صحابۂ کرامؓ کی محبت واُلفت میں موت نصیب فرمائے، آمین!

مسنون استخارہ (اہمیت-طریقہ-وضاحت طلب امور)

ترتیب: مولانا محمد شفیق الرحمٰن علوی۔ صفحات: ۸۔ طباعت: 2 کلر۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مکتبہ علوی، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0335-2102186

استخارہ ایک مسنون عمل ہے، استخارہ کا مطلب اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی کی درخواست ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ''جب تم میں سے کسی کو کوئی کام درپیش ہو تو فرض نماز کے علاوہ دو رکعت نماز (نفل) پڑھ لے۔'' (صحیح البخاری) اللہ تعالیٰ سے امید رکھنی چاہیے کہ استخارہ کے بعد وہی معاملہ ہوگا جو استخارہ کرنے والے کے حق میں انجام کے اعتبار سے بہتر ہوگا، ان شاء اللہ۔ استخارہ ایک ایسا عمل ہے جس سے ہر مسلمان کا اکثر وبیشتر واسطہ پڑتا ہے۔ زیرِتبصرہ کتابچہ میں استخارہ کا مفہوم اور مقصد، اہمیت، مسنون طریقہ، استخارہ کی دعا، مختصر استخارے کا مسنون طریقہ اور دعا اور استخارے سے متعلق چند ضروری وضاحتیں اور استخارے سے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ جیسے موضوعات اختصار کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔

زیرِتبصرہ کتابچہ مختصر اور جیبی سائز میں دو رنگہ طباعت سے مزیّن ہے، استخارہ کے موضوع پر ضروری مباحث کو اختصار کے ساتھ سمیٹے ہوئے یہ کتابچہ عوام الناس کی رہنمائی اور استخارہ کے مسنون طریقہ کی ترویج واشاعت کے لیے بہترین ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتابچہ کا نفع عام فرمائے اور مسلمانوں کو اپنے ہر معاملہ میں اس سنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فتنۂ انکارِ حدیث

علامہ محمد ایوب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ صفحات: ۸۰۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مدنی کتب خانہ، مدنی منزل، آر ۹۹۷، سیکٹر ۱۶-اے، بفرزون، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0323-2945381

قرآن کریم کے بعد احادیثِ نبویہ، دینِ اسلام کا دوسرا ماخذ اور وحیِ الٰہی ہی کی ایک صورت ہے۔ احادیثِ نبویہ آیتِ قرآنی ''تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْئٍ'' کی عملی شکل اور قرآن کریم کی تفسیر و توضیح ہے۔ بدقسمتی سے امت میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا جو قرآن کریم کا انکار نہیں کرسکا تو اس نے احادیثِ نبویہ کو اپنے نشانے پر رکھ لیا اور اس کے وحیِ الٰہی ہونے اور اُمتِ مسلمہ کے لیے قابلِ احتجاج ہونے سے منکر ہوگیا۔ وطنِ عزیز پاکستان میں مسٹر غلام احمد پرویز اور اس کی ذریت نے اس شجرۂ خبیثہ کو پروان چڑھایا۔ زیرِ نظر کتاب میں مؤلف محترم نے دلائل و براہین کی روشنی میں اس فتنے کے تار و پود بکھیر دیے ہیں۔

کتاب اپنے اختصار کے باوجود زیرِ نظر آٹھ عنوانات کے تحت مکمل و مدلل مواد پر مشتمل ہے:

۱-وحی کی کتنی صورتیں ہیں اور کیا کتابِ الٰہی کے علاوہ بھی وحی ہوسکتی ہے؟ ۲-حدیثِ رسول فی نفسہٖ دین میں حجت ہے یا نہیں؟ ۳-احادیثِ رسول کا جو معتبر مجموعہ ہمارے پاس ہے، وہ یقینی ہے یا ظنی؟ ۴-ظنِ شرعی حجت ہے یا نہیں؟ ۵-احادیثِ مسلَّمہ واجب العمل ہیں یا نہیں؟ ۶-منکرینِ حدیث کے جوابات، ۷-منکرینِ حدیث کے ترجمے کی غلطی، اور ۸-طلوعِ اسلام (جون، ۱۹۵۷ء) کے باب المرسلات کے جوابات!

اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کاوش کے ذریعے انکارِ حدیث کے مرض میں مبتلا مریضوں کو اس ایمان کش مرض سے نجات عطا فرمائے، آمین!

الشہاب الثاقب

مؤلف: شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ۔ صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: مدنی کتب خانہ، مدنی منزل، آر ۹۹۷، سیکٹر ۱۶-اے، بفرزون، نارتھ ناظم آباد، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0323-2945381

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اکابرینِ دیوبند سے دین کی تجدید و اصلاح کا جو کام لیا ہے، وہ شہرۂ آفاق ہے۔ ان خدامنش درویشوں نے جس للّٰہیت و اخلاص کے ساتھ بندگانِ خدا کو خدائے تعالیٰ کے ساتھ جوڑا ہے، اس نے دورِ صحابہؓ کی یاد تازہ کردی۔ مگر وائے افسوس! کہ ان کی ان خدمات کا کھلے دل سے

اعتراف کرنے کی بجائے اسے مسلکی تعصب کی عینک لگا کر دیکھا گیا اور دنیا کو ان سے متنفر کرنے کی کوشش کی گئی، مولوی احمد رضا خان صاحب نے اسی جذبے سے مغلوب ہو کر علمائے دیوبند کی عبارات میں قطع و برید کر کے انہیں علمائے حرمین کے سامنے پیش کیا اور ان سے علمائے دیوبند کی تضلیل وتکفیر کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی، چونکہ علمائے حرمین اصل صورت حال سے واقف نہیں تھے، اس لیے شیخ الاسلام والمسلمین شیخ العرب والعجم حضرت اقدس مولانا سید حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ جو اس وقت مدینہ منورہ میں تدریسِ علومِ نبوت میں مشغول تھے، نے علمائے حرمین کے سامنے صورت حال واضح کی اور اکابرین کی اصل عبارات پیش فرمائیں تو انہوں نے علمائے دیوبند کے مسلک کی تائید فرمائی۔

اس کی تمام تر تفصیلات حضرت مدنی قدس سرہٗ نے اپنی کتاب ''الشهاب الثاقب'' میں درج فرمادی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ فاضل بریلوی کے بانی دارالعلوم دیوبند حجۃ الاسلام حضرت اقدس مولانا محمد قاسم نانوتوی، فقیہ النفس حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ اسرارہم کی عبارات پر اعتراضات کے جوابات اور ان کی وضاحت فرمادی ہے۔

یہ کتاب بارہا شائع ہو چکی ہے، مدنی کتب خانہ نے حال ہی میں دوبارہ شائع کی ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....